ماہنامہ

میثاق

لاہور

محرم الحرام و صفر المظفر ۱۴۰۱ھ

★

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن - لاہور

(فون : 852683 - 852611)

چندہ سالانہ -/۲۰ _____ قیمت فی شمارہ -/۴

و قد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ

میثاق

لد ۳۰ | محرم الحرام و صفر المظفر ۱۴۰۱ھ | عدد ۲-۱

مشمولات

		صفحہ
★ عرض احوال	ڈاکٹر اسرار احمد	۱
★ خطاب به صدر مملکت	،، ،، ،،	۱۱
★ انفاق فی سبیل اللہ	،، ،، ،،	۱۷
★ اسلام اور پاکستان	،، ،، ،،	۲۲
★ ہجرت اور سن ہجری کا آغاز	مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم	۳۵
★ قرآن فہمی کے بنیادی اصول	مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ	۵۰
★ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات	محمد یونس جنجوعہ	۷۷
★ اسلام اور حقوق اطفال	مولانا غازی عزیر (سعودی عرب)	۸۱
★ ''تنظیم''	مولانا وحیدالدین خان	۱۰۲
★ مدیر ترجمان القرآن کی خدمت میں	مولانا سیدوصی مظہر ندوی	۱۰۵
★ مراد آباد (بھارت) سے دو خط	مولانا افتخار احمد فریدی	۱۱۵
★ ایک خط		۱۲۰

پبلشر: ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع: چوہدری رشید احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

عرضِ احوال

'میثاق' کا پیشِ نظر شمارہ سنِ عیسوی کے حساب سے تو ۱۹۸۱ء کے آخری دو مہینوں یعنی نومبر اور دسمبر کی اشاعتوں پر مشتمل ہے، لیکن اسلامی تقویم کے حساب سے ۱۴۰۱ھ کے پہلے دو مہینوں یعنی محرم الحرام اور صفر المظفر کی اشاعتوں کے قائم مقام ہے۔ اور چونکہ یکم محرم ۱۴۰۱ھ سے اسلامی کیلنڈر کا صرف نیا سال ہی شروع نہیں ہُوا بلکہ نئی صدی یعنی پندرھویں صدی ہجری کا آغاز بھی ہوا ہے لہٰذا ہم بھی اس شمارے سے نہ صرف یہ کہ نئی جلد کا آغاز کر رہے ہیں (جلد نمبر ۳۰) بلکہ آئندہ اِنْ شاء اللہ العزیز 'میثاق' کی اشاعتیں انگریزی مہینوں کے بجائے اسلامی مہینوں ہی سے منسوب ہوں گی!

——— (پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی مناسبت سے اس شمارے میں مولانا ابُوالکلام آزاد مرحوم کی ایک بصیرت افروز اور معلومات افزا تحریر بھی شائع کی جا رہی ہے۔)

گذشتہ شمارے میں کتابت وطباعت کی بہت سی غلطیوں اور خامیوں کے ساتھ ساتھ مضامین کے "بقیات" کے ضمن میں صفحات کے نمبروں میں بھی بہت تکلیف دہ غلطیاں تھیں جن کے ضمن میں متعدد قارئین کی جانب سے شکایتی خطوط موصول ہوئے۔ ہم ان سب سے معذرت خواہ ہیں۔ ویسے تو ہم اس کے مدعی نہیں ہیں کہ ہمارا عام معیار بھی ان معاملات کے اعتبار سے کچھ زیادہ بلند رہا ہے تاہم اس بار جس کوفت کا سامنا قارئین کو ہوا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ راقم ملک سے باہر تھا اور یہ سارا کام بالکل نئے رفقاء کے ہاتھوں ہوا۔ اور یہ معاملہ صرف اسی شمارے کا نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ سال سے بیرونی ممالک کے سفروں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے نتیجے

میں راقم الحروف 'میثاق' کی جانب بہت ہی کم توجہ کر سکا۔ اللہ کرے کہ ہم ایسا نظم قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ تمام معاملات ایک ہی شخص کی ذات سے وابستہ نہ رہ جائیں بلکہ ایک منظم ادارہ ایسا موجود ہو جو اس شخص کی عارضی یا مستقل غیر موجودگی میں بھی جملہ معاملات کو تسلسل اور حسن و خوبی کے ساتھ چلا سکے!

اس بار راقم ۲۲ اور ۲۳ اگست کی درمیانی شب کو کراچی سے عازم نیویارک ہوا تھا۔ اس سے متصلاً قبل اسلام آباد میں حکومت پاکستان کے زیر اہتمام "علماء کنونشن" منعقد ہوا تھا۔ اور اگرچہ راقم نہ فی الواقع "علماء" کے زمرے میں شامل ہے، نہ ہی اس سے قبل کسی موقع پر مرکزی تو کیا صوبائی حکومت ہی نے اسے علماء کرام کے کسی ایسے مؤقر اجتماع میں شرکت کے لائق گردانا تھا۔ تاہم اس موقع پر اس کنونشن کا دعوت نامہ ہی نہیں آیا۔ ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعے تاکید بھی ہوئی۔ راقم نے معذرت کر دی کہ چونکہ کنونشن ۲۱ اگست کو ہے اور میری ۲۲ کو کراچی سے امریکہ کی روانگی طے ہے لہٰذا میں شرکت نہیں کر سکتا۔ اس پر اطلاع ملی کہ کنونشن سے چار روز قبل ۱۷ اگست کو مجوزہ کنونشن ہی کے ضمن میں ایک خصوصی مشاورتی اجلاس ہو رہا ہے محترم صدر مملکت کی شدید خواہش ہے کہ اس میں آپ ضرور شریک ہوں۔ اس کے ضمن میں چونکہ عذر کوئی موجود نہ تھا لہٰذا اس میں شرکت ہوئی اور دونوں (۱۷ و ۱۸ اگست) پر پھیلی ہوئی متعدد نشستوں میں محترم صدر مملکت اور ان کے بعض نہایت قریبی رفقاء کار سے نہایت بے تکلف ماحول میں تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ ان ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے بھی بعض نہایت دلچسپ مشاہدات اور تأثرات ہیں جن میں اگر کبھی موقع ہوا تو ان شاء اللہ قارئین 'میثاق' کو بھی شریک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ۱۸ اگست کے اجلاس کے اختتام پر صدر صاحب نے راقم سے براہ راست ہی دریافت فرما لیا کہ امریکہ کے لئے روانگی کب ہے؟ اور جب میں نے بتایا کہ ۲۲ اور ۲۳ کی درمیانی شب کو، تو انہوں نے اصرار فرمایا کہ پھر کنونشن میں بھی ضرور شرکت کرو، تمہارے یہاں اسلام آباد سے براہ راست کراچی پہنچانے کا اہتمام کر دیا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑی پیشکش جو انہوں نے کی اس کو قبول کرنے سے تو راقم نے شکریے کے ساتھ معذرت کر دی تاہم

کنونشن میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔

یہ کنونشن ۲۱ اگست کو پاکستان سیکریٹریٹ کی عمارت میں ہُوا۔ اور اس میں ملک کے ہر گوشے سے ڈھائی تین صد کے لگ بھگ علماء و فضلاء شریک ہوئے۔ پروگرام کے مطابق اس کی صرف دو نشستیں منعقد ہونی تھیں ایک صبح ۹ بجے سے نماز ظہر تک اور دوسری ظہر اور ظہرانے کے بعد سے نماز عصر تک رات کو صدر صاحب کی جانب سے ایک عشائیہ تھا۔ دوسرے اجلاس میں کنونشن میں ایک یوم کی توسیع کا فیصلہ کا اعلان ہو گیا۔ تاہم راقم نے دوسرے اجلاس کے اختتام پر صدر صاحب سے رخصت حاصل کر لی۔ اور رات کو جب سب شرکاء ڈنر کے لئے پریذیڈنٹ ہاؤس جا رہے تھے راقم اسلام آباد ایئرپورٹ سے براہ راست عازم کراچی ہو گیا۔

کنونشن کے پہلے دن کی دو نشستوں میں کچھ وقت تو مرکزی وزارت امور مذہبی کے سیکرٹری اور متعلقہ وزیر باتدبیر کے کلماتِ خیر مقدم اور صدر مملکت کے مختصر افتتاحی خطاب میں صرف ہوا اور کچھ وقت جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل نے لیا جس میں انہوں نے کونسل کی کارگذاری کا مختصر جائزہ پیش فرمایا۔ باقی تمام وقت مدعوئین کو اظہارِ خیال کے لئے دیا گیا۔ اور اس ضمن میں اگرچہ عمومی رہنمائی کے لئے تین عنوانات متعین کر دیئے گئے تھے تاہم کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی بلکہ ہر شخص کو کھلی آزادی تھی کہ جو چاہے کہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ علماء کرام نے اپنے دل کی بھڑاس خوب خوب نکالی اور راقم الحروف داد دیئے بغیر نہ رہ سکا صدر ضیاء الحق صاحب کی ہمت اور حوصلے کو کہ انہوں نے پورے صبر و سکون کے ساتھ اور بغیر ایک حرف زبان سے نکالے تمام علماء کی تقاریر کو سنا۔ حتیٰ کہ بعض مقررین پر روک ٹوک سامعین کی جانب سے تو ہوئی صدر صاحب نے خواہ مخواہ کے طولِ کلام پر بھی ایک حرف تک زبان سے نہ نکالا۔ گویا کہ سورۂ زمر کی آیت ۱۸ کے الفاظ مبارکہ ـــــ "اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ" میں وارد شدہ دو امور میں سے ایک یعنی "استماعِ قول" کے بارے میں تو اطمینان ہوا کہ بحمداللہ صدر ضیاء الحق صاحب میں بخوبی موجود ہے، رہی دوسری چیز یعنی "اتباعِ احسن" تو یہ ذرا مشکل مرحلہ ہے تاہم اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال ہو تو بعید بھی نہیں!

راقم الحروف نے بھی کنونشن سے خطاب کیا - اور اپنے اظہار خیال کے لئے "اسلامی قانون کی تنفیذ اور فقہی و گروہی اختلافات" کا عنوان منتخب کیا - وقت اگرچہ بہت مختصر تھا ـــــ اور موضوع نہایت تفصیل طلب تاہم اللہ کا شکر ہے کہ اختصار کے ساتھ کچھ باتیں مرتب صورت میں بیان ہو گئیں اور اللہ کے فضل و کرم سے ایسا نہیں ہوا کہ بعد میں راقم کو یہ احساس ہوا ہو کہ تقریر کی روانی میں کوئی غلط بات زبان سے نکل گئی یا کوئی اہم بات بیان ہونے سے رہ گئی ـــــ یہ کنونشن چونکہ بالکل بند کمرے میں تھا اور اس کی تقاریر کی اشاعت وغیرہ خارج از بحث تھی لہٰذا راقم نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند اشارات نوٹ کر لئے جو تقریر تقریباً البدیہہ کی تھی اسے بعد میں بھی مرتب کرنے کا کوئی خیال نہ آیا۔ لیکن دورۂ امریکہ سے واپسی پر لاہور میں اس کا جو تذکرہ سنا - اور جہاں بعض حلقوں کی جانب سے اس کی تحسین و تائید موصول ہوئی وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض حلقوں میں اس کی بعض باتوں کو بہت غلط رنگ میں پیش کر کے نہایت بھونڈی تنقید ہو رہی ہے تو راقم نے جمعہ ۳۱ اکتوبر کو مسجد شہداء میں درس قرآن کے بجائے بعض دوسرے امور کے ساتھ ساتھ اپنی اس تقریر میں پیش شدہ نکات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی - یہ تقریر ٹیپ کر لی گئی تھی ـــــ اور اب ٹیپ کے فیتے سے صفحہ قرطاس پر بھی منتقل ہو چکی ہے - ان شاء اللہ آئندہ اشاعت میں اسے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا -

---

امریکہ اور کینیڈا کے دورے میں اس سال لگ بھگ دو ماہ صرف ہوئے - اور گذشتہ سال کے مانند اس بار بھی ایک بڑا "مورچہ" ٹورنٹو میں لگا جہاں دو ہفتے تو مسلسل ڈوکس قرآن اور خطابات عام کا سلسلہ جاری رہا - اور بعد میں انجمن خدام القرآن ٹورنٹو کی تشکیل اور تنظیم اسلامی کے قیام کے سلسلے میں ایک ایک دو دو دن کے لئے تین بار مزید جانا پڑا - روزانہ درس کی حاضری گذشتہ سال ہی کی طرح دو ڈھائی صد رہی - خطبات جمعہ اور ہفتہ اور اتوار کے دروس میں حاضری اس سے کہیں زیادہ ہوتی تھی - ان دو ہفتوں میں سے دو دن اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے سالانہ کنونشن میں شرکت کی نذر ہوئے جو مشہور عالم آبشار نیاگرا کے عین سامنے نیاگرا اسٹی میں شیریٹن ہوٹل میں منعقد ہوا - جس کے آخری اجلاس میں راقم نے "پندھرویں صدی ہجری کے چیلنج، خطرات

اور توقعات" کے عنوان سے مقالہ پڑھا (جو پاکستان میں روزنامہ 'مسلم' اسلام آباد میں شائع ہو چکا ہے اور ہندوستان میں ہفت روزہ 'ریڈینٹ' (RADIANT) دہلی میں!)

——— علاوہ ازیں انہی ایام میں ایک روز وقت نکال کر راقم نے برادرم سمیع اللہ صاحب اور برادرم محمد نجم طاہر صاحب کے ساتھ ایک چکر 'بغلو' کا برادرم ڈاکٹر احمد فاروق مودودی خلف الرشید مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ملاقات کے لئے لگایا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا کرم ہے کہ انہوں نے میری وجہ سے ڈیوٹی سے نصف یوم کی رخصت لی، اور نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور صرف یہ کہ دو ڈھائی گھنٹے بے تکلفی کے ساتھ اور بغیر کسی ذہنی تحفظ کے ذاتی، خاندانی اور تحریکی امور پر گفتگو میں حصہ لیا بلکہ نہایت محبت اور اصرار کے ساتھ کھانا کھلایا۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء!۔

بالکل ٹورنٹو ہی کی طرح کا بھرپور معاملہ اس سال شکاگو میں رہا۔ جہاں گیارہ دن تو مسلسل قیام رہا۔ جس کے دوران روزانہ درس قرآن کے علاوہ بہت سے اجتماعات میں شمولیت اور خطاب کا موقع ملا۔ اور ٹورنٹو ہی کی طرح انجمن کی تشکیل اور تنظیم کے قیام کے سلسلے میں دو مرتبہ مزید جانا ہوا۔ روزانہ درس قرآن کی حاضری اس بار شکاگو میں ٹورنٹو سے بڑھ گئی۔ سیرت النبیؐ کے موضوع پر منعقدہ ایک جلسے میں تو حاضری چھ سات صد سے بھی متجاوز تھی۔ یہ جلسہ شکاگو کے ایک وسیع و عریض مرکز تقریبات بیکارمک پلیس کے ہال میں منعقد ہوا جس میں راقم نے نہایت مفصل تقریر کی۔

ٹورنٹو میں راقم نے مطالعہ قرآن حکیم کے اپنے مرتب کردہ "منتخب نصاب" کے کچھ مقامات کا درس تو پچھلے سال دیا تھا۔ جن کے ٹیپ وہاں برادرم سمیع اللہ صاحب نے نہایت محنت اور جانفشانی سے تیار کر کے بہت وسیع حلقے میں پہنچا دیئے تھے، اس سال راقم نے وہاں اُس نصاب کے بقیہ مقامات کا درس دے کر گویا اس کی تکمیل کر دی اور اُمید واثق ہے کہ اس مکمل نصاب کے ٹیپ شدہ دروس کے ذریعے ان شاء اللہ العزیز امریکہ میں دعوتِ قرآنی کی محکم اساس قائم ہو جائے گی۔

شکاگو میں اس بار تسلسل کے ساتھ سورۂ حدید کا درس ہوا۔ جس کے فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ایک ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر طور صاحب نے ریڈیو ٹیپ تیار کرائے جو لگ بھگ اٹھارہ گھنٹوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خدا کرے کہ 'خطاب بہ اُمتِ مسلمہ' کے ضمن

ہیں قرآن حکیم کے اس "ذرد و سنام" کے درس کے یہ ٹیپ کچھ لوگوں کو اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے کمربستہ کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ!

ٹورنٹو اور شکاگو دونوں مقالات پر بحمداللہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ذیلی انجمنیں بھی قائم ہوگئیں اور تنظیم اسلامی کی شاخیں بھی۔ ٹورنٹو کی انجمن کے صدر ڈاکٹر نسیم اللہ خاں صاحب مقرر ہوئے جو نفسیات میں پی ایچ ڈی ہیں اور تعلیمی نفسیات کے میدان میں کنسلٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، ان کا تعلق تحریک اسلامی سے کافی پرانا ہے اور کالج کے دور میں وہ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے فعال کارکن رہے ہیں، شکاگو انجمن کے صدر میر محمد الدین صاحب منتخب ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر میر ولی الدین مرحوم (حیدرآباد دکن) کے صاحبزادے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سرزمین شمالی امریکہ میں یہ دونوں انجمنیں قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے اور اعلیٰ سطح پر نشر و اشاعت کے کام کی داغ بیل ڈال سکیں۔

ان دونوں ہی مقامات پر اللہ کے فضل و کرم اور اس کی تائید و توفیق سے بعض حضرات نے اگلا قدم بھی اٹھالیا ـــــ یعنی "سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد" کی بیعت کے سلسلے میں منسلک ہو کر "تنظیم اسلامی" میں شمولیت اختیار کرلی۔ اور "مقامی تنظیمیں ارضِ امریکہ میں قائم ہوگئیں۔ اور دعوتِ قرآنی کی یہ تاثیر اور اعجازِ قرآنی کے یہ عملی مظاہر بھی دیکھنے میں آئے کہ ایک مقام پر ایک صاحب نے جو بنک سے سود پر لی ہوئی رقم کی بدولت پانچ پٹرول پمپ چلا رہے تھے فوراً تین پمپ بند کر دیئے اور صرف دو پر اکتفا کرلی جنہیں وہ اپنے ذاتی سرمایے سے چلا سکتے تھے، دوسرے مقام پر ایک صاحب نے اپنے مکان پر جو انہوں نے "بنک کے پاس رہن" کے اصول پر سودی قرضے سے لیا تھا فوراً "بجائے فروخت" کی تختی لگادی اور جب راقم وہاں دوسری بار گیا تو معلوم ہوا کہ مکان فروخت ہو چکا ہے لیکن بنک کے چنگل سے پوری طرح نکلنے کے لئے انہیں چند ہزار ڈالر کی مزید ضرورت ہے، اس پر دینی اخوت، رفاقت کا یہ نادر مظہر بھی سامنے آیا کہ امریکہ کے حد درجہ مادیت پرست معاشرے میں جہاں بین الانسانی علائق میں واقعتہً "نفسی، نفسی" کا دور دورہ ہے، ایک دوسرے رفیقِ تنظیم نے شدید اصرار کے ساتھ مطلوبہ رقم "قرضِ حسنہ" کی صورت میں فراہم کر دی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات پر اپنی کتابِ عزیز کے صدقے میں رحمتوں کا نزول فرمائے اور ہمیں

اور انہیں سب کو راہِ حق میں ثبات و استقامت عطا فرمائے ۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا وَاِیَّاھُمْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ !! آمین !!!

یہ انجمنیں اور تنظیمیں وہاں جس نہج پر کام کا آغاز کر رہی ہیں اُس کا اندازہ شکاگو سے آمدہ ایک خط سے ہو سکتا ہے ۔ وھُوَ ھٰذا :۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ڈاکٹر صاحب

السّلام علیکم

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے کافی دنوں سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر بے انتہا مصروفیت کی وجہ سے قاصر رہا اُمید ہے کہ آپ اس کوتاہی کو نظر انداز کر دیں گے ۔ آپ کے جانے کے بعد سے ہم لوگ باقاعدہ ہر ہفتہ کو بسلسلہ اجتماع انجمن خدام القرآن ایم سی سی (مسلم کمیونٹی سنٹر) میں جمع ہوتے ہیں جو کہ دن کے ۱۲ بجے سے ۳ بجے تک جاری رہتا ہے ۔ الحمد للہ کہ میر حمید الدین صاحب کافی محنت کر رہے ہیں اجتماع کی کارروائی تین گھنٹے جاری رہتی ہے ان تین گھنٹوں میں سے ۱½ گھنٹہ تجوید قرآن اور عربی کے سیکھنے میں صرف ہوتا ہے باقی وقت آپ کے درس کے ٹیپ سننے میں صرف ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ آئندہ آپکے تشریف لانے تک ہم لوگوں میں اخوت، محبت اور دین سے وابستگی کی وہ کیفیات برقرار رہیں گی ۔ جن سے ہم نے کام شروع کیا ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ اُمید افزا نتائج برآمد ہوں ۔ آمین ۔

ماشاء اللہ تنظیم کا کام بھی آگے بڑھ رہا ہے ۔ اقبال پٹیل صاحب نے اپنا انڈیا جانا فی الوقت ملتوی کر دیا ہے شاید اب موسم گرما میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ اس کی وجہ سے مجھے کافی تقویت پہنچی ہے چونکہ ضیاء الدین صاحب عنقریب ہی شادی کے سلسلہ میں پاکستان جانے والے ہیں اس لئے فی الوقت میں نے اور اقبال صاحب نے تنظیم کا کام بانٹ لیا ہے وہ اس سلسلے میں شکاگو شہر میں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں اور میں اس کی مغربی بستیوں میں محنت کر رہا ہوں ۔ اللہ کے فضل و کرم سے سات آٹھ آدمی میرے خیالات سے اب تک متفق ہو چکے ہیں اور ہر جمعہ کو اس سلسلے میں بھی اجتماع ہوتا ہے بعد نماز جمعہ درس کے ٹیپ سنے جاتے ہیں ۔ ایک دو حضرات نے تو تنظیم میں شمولیت کا بھی ارادہ ظاہر کیا ہے مگر میں نے انہیں کچھ دن اور اچھی طرح سوچ

سمجھ لینے کی تلقین کردی ہے، آپ کی موجودگی میں انجمن کے سلسلے میں تو کافی تفصیلی گفتگوئیں رہیں مگر بدقسمتی سے تنظیم کے طریق کار کو سمجھنے کے لئے مناسب وقت نہیں مل سکا۔ اب امید ہے کہ آپ خط کے ذریعہ سے تفصیلاً آگاہ فرماکر شکریہ کا موقع دینگے۔

اقبال صاحب ہر ہفتہ ایک مختلف گروہ میں جاتے ہیں جس میں دین کی تبلیغ اور درس قرآن کے ٹیپ سنانا شامل ہے نتائج اُمید افزا نظر آتے ہیں اللہ تعالےٰ سے میری دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ انہیں اور ہم سب کو اس نیک کام کی توفیق عطا فرمائے اور ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی ہمت عطا فرمائے آمین آپ بھی ہمارے حق میں دُعا فرمایئے۔

آپ کے جانے کے بعد دو تین اہم کام ہوئے ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کا افتتاح ہوا جس میں پرنس فیصل اور چند دوسری اہم شخصیتوں نے شمولیت کی۔ ہاں میں آپ کو ایک خوشخبری سنانا تو بھول ہی گیا، اقبال پٹیل صاحب اور ڈاکٹر خورشید ملک صاحب نے داڑھی رکھ لی ہے۔ اللہ کرے کہ اتباعِ سنّت کا جذبہ اور زیادہ ہو۔ اب آپ سنایئے وہاں کے کیا حال ہیں؟ جو وقت آپنے یہاں صرف کیا اب اس کی تلافی وہاں کرنی پڑ رہی ہوگی۔ ہم لوگ یہاں اتنی دُور ہیں کہ آپ کی کسی قسم کی عملی مدد نہیں کرسکتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا۔ اب اجازت چاہونگا۔ ان شاءاللہ پھر ملاقات ہوگی اب ہم لوگوں کی طرف سے تمام حضرات کو حسب مراتب سلام و دُعا پہنچادیں۔

احقر:۔ احمد سلیم صدیقی۔

ٹورنٹو اور شکاگو کے علاوہ اس بار کینیڈا میں تین روز کے لئے صرف مانٹریال جانے کا موقع مل سکا۔ اوٹوا کے احباب کی جانب سے شدید اصرار کے باوجود وہاں کے لئے وقت نہ نکل سکا۔ البتہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے متعدد شہروں میں دو دو تین تین دن کے لئے جانا ہوا۔ چنانچہ بالٹی مور اور واشنگٹن کی بھی گذشتہ سال کی یادیں تازہ ہوئیں۔ اور نیویارک میں تو دو مرتبہ میں سات آٹھ روز کے قیام کی صورت بن گئی۔ علاوہ ازیں امریکہ کے مغربی ساحل پر واقع مشہور شہر لاس اینجلیز بھی جانا ہوا، چنانچہ بحرالکاہل کی بھی 'زیارت' کا موقع مل گیا ——— اور جنوب مشرقی علاقے کے اہم شہر اٹلانٹا (جیا رجیا) بھی جانا ہوا۔ (کینیڈا کے مغربی کنارے کے اہم شہر وینکوور سے بھی شدید تقاضا رہا۔ لیکن وہاں کے لئے بھی وقت

نہ نکل سکا)۔

ان تمام مقامات پر درسِ قرآن کی نہایت کامیاب مجالس منعقد ہوئیں جن کی یادیں بھی ابھی تک ذہن میں تازہ ہیں اور وہاں کے احباب کے خلوص و اخلاص اور محبت اور گرم جوشی کے نقوش بھی لوحِ قلب پر پوری طرح کندہ ہیں۔ خاص طور پر مانٹریال کے بھائی محمد شفیق صاحب، جناب غوث پاشا صاحب، اور ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب کے دین سے شغف اور دینی کاموں کے لئے سرگرمی کا نہایت گہرا اثر میرے دل نے قبول کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر رؤوف خالد صاحب کی ملاقات بھی ذہن پر گہرے نقش چھوڑ گئی۔ اسی طرح اٹلانٹا کے جناب اقبال گدائی صاحب اور اوریج کاؤنٹی لاس اینجلیز کے جناب اعظم قریشی صاحب کی ملاقاتوں کے بھی نہایت گہرے نقوش قلب و ذہن پر قائم ہوئے۔ نیویارک میں جن احباب سے گذشتہ سال کی ملاقات کی تجدید ہوئی ان میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سابق ناظمِ اعلیٰ میاں محمد رشید صاحب کے صاحبزادے عزیزم طارق رشید اور استاذی المکرم ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ صاحب مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر نعیم اللہ کے علاوہ تحریکی مزاج اور فعّال شخصیتوں کے مالک اور باہم صدرجہ شیر و شکر دوست جناب شمشیر علی بیگ اور محترم ذکاء اللہ پیرزادہ ——— اور مزاجاً نہایت دھیمے لیکن مستقل مزاجی سے کام کرنے والے ڈاکٹر قیصر صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ بالکل نئی ملاقاتوں میں جناب شمیم صدیقی صاحب کا کام قابل ذکر ہے۔ تحریک اسلامی کے ساتھ ان کا قلبی و ذہنی رشتہ بہت پرانا ہے اور اس کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں وہ بے حد متفکر ہیں چنانچہ ان سے نہایت بے تکلفانہ ماحول میں بہت طویل گفتگوئیں۔ ایک اور 'تجدید ملاقات' بھی قابل ذکر ہے۔ نیویارک کے اسلامک سنٹر میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک نوجوان والہانہ انداز میں لپٹ گئے ——— انہوں نے پوچھا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں" میں ابھی ذہن پر زور دے ہی رہا تھا کہ انہوں نے آہستہ سے کہا "محمود!" اور اب میری باری تھی چنانچہ میں نے بھی انہیں گرم جوشی سے لپٹا لیا ——— واقعۃً بہت سی پرانی یادیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ یہ تھے اسلامی جمعیتِ طلبہ لاہور و پنجاب کی نظامت کے دور میں میرے نائب اور دستِ راست خواجہ محبوب الٰہی کے برادرِ خورد ڈاکٹر محمود احمد خواجہ ——— !! (جن کی یہ اتفاقی ملاقات خود خواجہ محبوب الٰہی کے ساتھ تجدید

ملاقات کا ذریعہ بن گئی چنانچہ پاکستان آکر میں نے ان سے ملاقات میں 'پہل' کی ـــــ اور عرصۂ دراز سے جمی ہوئی "برف ٹوٹ گئی!")

اسی قسم کا تذکرہ اگر ٹورنٹو اور شکاگو کے احباب کا کیا جائے تو سلسلہ بے حد طویل بھی ہو جائے گا۔ اور میرے لئے اُن میں تقدیم و تاخیر کا فیصلہ بھی آسان نہ ہوگا۔ البتہ ٹورنٹو کے احباب میں سے برادرم محمد نجم طاہر صاحب اور برادرم سلیم معین الدین صاحب کا شکریہ میرے ذمے واجب الادا ہے اسلئے کہ طاہر صاحب کے یہاں مسلسل دس روز کے لگ بھگ قیام رہا۔ اور سلیم صاحب کے یہاں بھی کئی دن ٹھہرنا ہوا (برادرم حافظ سعید احمد صاحب کا ذکر اس لئے نہیں کر رہا کہ ان سے تو عزیز داری بھی ہے!) شکاگو میں قیام کا مستقل 'ٹھیکہ' برادرم ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کے پاس رہا۔ جن کے بارے میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان کا دل زیادہ مسلمان ہے یا دماغ؟ ـــــ ان کے علاوہ برادرم پیر محمد صاحب کا شکریہ میرے ذمے واجب الادا ہے، انہوں نے اپنے کام سے طویل رخصت لے کر جس طرح میرے پورے قیام شکاگو کے دوران ہی اپنے آپ کو مجھ سے منتقی نہیں کر لیا تھا بلکہ لاس اینجلیز کے طول طویل سفر اور پلین فیلڈ، (انڈیانا پولس) میں واقع ایم ایس اے کے ہیڈ کوارٹرز کی 'زیارت' میں بھی رفاقت اختیار کی۔ اس کے لئے میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اللہ تعالےٰ انہیں اس کی جزا عطا فرمائے۔ ـــــ اور ان کے جذبۂ دینی کو مزید جلا بھی بخشے اور ثبات و دوام بھی عطا فرمائے!!

امریکہ کے اس سال کے دورے میں راقم نے سفر بہت کیا۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ۵۷ دنوں میں لاہور سے اسلام آباد، اسلام آباد سے کراچی، کراچی سے نیویارک، نیویارک سے ٹورنٹو، ٹورنٹو سے مانٹریال، مانٹریال سے پھر ٹورنٹو، ٹورنٹو سے شکاگو، شکاگو سے لاس اینجلیز، لاس اینجلیز سے پھر شکاگو، شکاگو سے اٹلانٹا اور اٹلانٹا سے پھر ٹورنٹو، ٹورنٹو سے نیویارک، وہاں سے بالٹی مور اور واشنگٹن (بذریعہ کار) واشنگٹن سے پھر (تیسری بار) شکاگو، شکاگو سے پھر ٹورنٹو (چوتھی بار)، ٹورنٹو سے نیویارک اور بالآخر نیویارک سے کراچی اور کراچی سے لاہور۔ یہ تمام سفر تو با تشنائے واحد ہوائی جہاز سے ہوئے۔ ان کے علاوہ ٹورنٹو سے نیاگرا اور واپسی، پھر ٹورنٹو سے بفلو اور واپسی، اور شکاگو سے پلین فیلڈ اور واپسی بذریعہ کار ہوئی ـــــ اور ویسے بھی اس پورے عرصہ کے دوران روزانہ اوسطاً تین گھنٹے کار ہی میں

(بقیہ صـ۱۶ پر)

خطاب بہ صدرِ مملکت

★ اسرار احمد ★

قارئین "میثاق" میں سے اکثر کے علم میں ہوگا کہ راقم الحروف کئی سال سے مسجد دارالسلام، باغِ جناح، لاہور میں خطبہ جمعہ دے رہا ہے، جمعہ ۲۸ نومبر کو صدر پاکستان محترم ضیاء الحق صاحب صدرِ انڈونیشیا جناب سوہارتو کے استقبال کے لئے لاہور تشریف لائے تو جمعہ کی نماز انہوں نے مسجد دارالسلام میں ادا فرمائی۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے راقم الحروف نے کچھ گزارشات ان کی خدمت میں پیش کیں جنہیں ٹیپ سے اتار کر ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

الحمدللہ کہ محترم صدر صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان گزارشات کو خندہ پیشانی سے سُن کر "یستمعون القول" کی ایک مزید شاندار مثال پیش فرمادی بلکہ نماز کے بعد راقم سے یہ فرما کر کہ میں آپ کی باتوں پر پوری سنجیدگی سے غور کروں گا "فیتبعون احسنہ" کی امید بھی پیدا فرمادی۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْہُ وَاِیَّانَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی، آمین، خاکسار اسرار احمد

"آپ حضرات کے علم میں ہے کہ آج صدر مملکت جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لئے اس مسجد میں تشریف فرما ہیں یہ ہمارے لئے بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگرچہ ایک پہلو سے ذرا تکلیف بھی ہوئی ہے چونکہ باغ میں ہم نے سیکوریٹی کا کچھ زیادہ ہی اہتمام دیکھا (یہ اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ انڈونیشیا کے صدر جناب سوہارتو صاحب نماز جمعہ کے بعد عصرانہ میں شرکت کے لئے باغ جناح میں تشریف لانے والے تھے) شاید ہمارے چند مستقل نمازی ان غیر معمولی حفاظتی انتظامات کی وجہ سے مسجد تک نہ پہنچ

سکے ہوں اور لوٹ گئے ہوں ۔ بایں ہمہ صدر مملکت کی موجودگی ہمارے لئے بڑی مسرت کی بات ہے ۔ میں اس موقع پر چند باتوں کی طرف صدر صاحب کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔ یہ کام میں اس امید پر کر رہا ہوں کہ صدر صاحب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں ایک خالص غیر سیاسی آدمی ہوں ۔ میں اُس وقت بھی عملی طور پر غیر سیاسی آدمی تھا ، جب یہاں سیاست کی بڑی کھچڑیاں پک رہی تھیں اور بہت سے لوگوں نے بہتی گنگا سے خوب ہاتھ دھوئے تھے ۔ میں اُس وقت بھی تمام ہنگامی کاموں سے بالکلیہ الگ تھلگ رہا اور اُسی کام میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف رہا ۔ جس کو میں نے پورے شعور اور محاسبہ اُخروی کے احساسِ مسئولیت کے ساتھ اختیار کیا تھا اور اپنا نصب العین بنایا تھا یعنی قرآن حکیم کی روشنی میں اعلائے کلمۃُ اللہ اور تجدید ایمان کے لئے سعی وجہد ، اور دعوت و تبلیغ ، الحمدُ للہ میں اس کام میں پوری یک سوئی کے ساتھ لگا رہا اور لگا ہوا ہوں اور اللہ تعالےٰ کا صد ہزار شکر کہ اس نے ہر قسم کی سیاسی اور ہنگامی ترغیبات کی طرف مجھے آنکھ اُٹھانے سے محفوظ رکھا ہے ۔ میں فی الوقت صدر صاحب کی خدمت میں جو معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں وہ اس امید پر کہ موصوف ان کو تحمل کے ساتھ سنیں گے ۔ مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ صدر صاحب نے بہت سے لوگوں کی باتیں کمال تحمل اور صبر کے ساتھ سنی ہیں ۔ علماء کنونشن میں واقعہ یہ ہے کہ صدر صاحب نے لوگوں کی لمبی لمبی تقریریں جس تحمل و صبر کے ساتھ سنی ہیں میں ان کے حوصلہ اور ہمت کی داد دیتا ہوں ۔ آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ لوگوں کی فکری و ذہنی سطح میں عظیم تفاوت ہوتا ہے ۔ مختلف ذہنی و فکری سطح کے لوگ جب کسی پلیٹ فارم پر تقریروں کے لئے آتے ہیں تو ان میں تقریریں کام کی بھی ہوتی ہیں اور بھرتی کی بھی ہوتی ہیں ۔ ایسے مقررین بھی ہوتے ہیں جو زور بیان و تقریر کے اظہار کے لئے اپنی تقریر طویل تر کر دیتے ہیں اور متعلق و غیر متعلق موضوعات پر کافی وقت لے لیتے ہیں ۔ لیکن میں نے علماء کنونشن میں دیکھا ہے کہ صدر صاحب نے بڑے سکون اور توجہ کے ساتھ سب کی باتیں سُنیں ۔ ان کے اس حوصلے اور ہمت کی داد نہ دینا ظلم ہے لہذا میں نے ان کے اس وصف کا تذکرہ اپنے امریکہ کے حالیہ دورے میں بھی متعدد مقامات پر کیا اور یہاں بھی اپنی تقریروں میں اور اپنے احباب و رفقاء کی مجالس میں بھی اس کا ذکر کیا ہے ۔

میں اس موقع پر چند چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف صدر مملکت کی توجہ منعطف کرانا چاہوں گا۔ میں بڑی بڑی باتوں کا ذکر دانستہ نظر انداز کر رہا ہوں چونکہ بات موقع و محل کی مناسبت سے کہنی مفید ہوتی ہے۔ باتیں گو چھوٹی ہیں لیکن وہ صرف بظاہر ہی چھوٹی ہیں ورنہ ان کا گہرا تعلق ہمارے مجموعی فکر کے ساتھ ہے۔ ایک صاحب نے ایک مرتبہ کہا تھا اور بالکل درست کہا تھا کہ "ہم مسلمانوں کی ایک غلطی یہ بھی ہے کہ ہم بڑی بڑی باتوں کے متعلق تو بہت سوچتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ یہ چھوٹی باتیں بسا اوقات بڑی باتوں کے حل میں مانع ہوتی ہیں۔

اس موقع پر میں صدر صاحب کی خدمت میں پہلی بات تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لئے جائزہ لیجئے کہ ہمارے ملک میں کرکٹ کے کھیل کو حکومت کی جو غیر معمولی سرپرستی حاصل ہے تو کیا یہ گیم قرآن مجید کی طرف سے ہم پر عائد کیا گیا ہے یا سنتِ رسولؐ سے ماخوذ ہے یا ہماری روایات اور تہذیب کا کوئی لازمی حصہ ہے۔ اس کھیل کی وجہ سے پانچ پانچ اور چھ چھ دن ہماری پوری قوم معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ کھیل کی وجہ سے دفتروں میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ لوگ یا تو ٹی۔ وی کھولے کھیل دیکھتے ہیں یا ٹرانسسٹر ریڈیو کے ذریعہ کامنٹری سنتے ہیں۔ غور کیجئے کہ کتنا قیمتی وقت قومی سطح پر ضائع ہوتا ہے۔ ہمارے گیمز اور بھی ہیں، جو ڈیڑھ دو گھنٹے میں کھیلے جاتے ہیں۔ ان میں ایکشن ہے۔ حرکت ہے۔ جوانمردی ہے۔ ایسے گیمز کی سرپرستی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ کرکٹ کا گیم واقعہ یہ ہے میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر کیوں ہم نے اسکو سرفہرست رکھ چھوڑا ہے۔ جبکہ اس گیم کا ہماری روایات سے اور ہماری تہذیب سے کوئی تعلق نہیں! کیا محض اس لئے کہ یہ گیم ہمارے سابق بدیشی حکمرانوں کا خاص اور پسندیدہ کھیل ہے اس کو جاری رکھا گیا ہے! حقیقت یہ ہے کہ اس کھیل کی سرپرستی کا کوئی جواز یا فائدہ میری سمجھ میں نہیں آتا، وقت کا قومی سطح پر زیاں۔ پھر اس کھیل پر لاکھوں کا خرچ! جو فضول خرچی اور اسراف کے ذیل میں آتا ہے۔ اس لئے میں عرض کروں گا۔ کہ ہمدردی سے جائزہ لیجئے کہ اس گیم کی سرپرستی سے قومی سطح پر نقصان اور فائدے کا تناسب کیا ہے پھر کوئی مثبت قدم اٹھائیے!

دوسری بات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک کے حوالے سے پیش

کرنا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ :-

"میں اپنی اُمّت کے بارے میں جس بات کا سب سے زیادہ اندیشہ رکھتا ہوں وہ عورتوں کا فتنہ ہے" (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلّم) خدا کے لئے سوچئے ہمارے دین کی کچھ روایات ہیں۔ کچھ شعائر ہیں۔ ہماری شریعت میں جہاں زنا اور قذف کے لئے حدود و تعزیرات مقرر کی گئی ہیں، وہاں ستر و حجاب کے لئے بھی کچھ احکامات دیئے گئے ہیں اور کچھ قیود و عائد کی گئی ہیں۔ میں یہ بات مختلف مواقع پر اپنی تقاریر اور تحریرات میں عرض کر چکا ہوں اور ٹیلی ویژن پر بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ شریعت کے تمام احکام کو نافذ نہیں کریں گے تو یہ شریعت پر ظلم ہوگا اور لوگوں پر بھی ظلم ہوگا۔ ہمیں اپنی روایات کی طرف دیکھنا چاہیئے اور ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم ان سے روگردانی تو نہیں کر رہے

میں بڑی دلسوزی کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ پتہ نہیں کہ میری زندگی کتنی ہے اور کتنی زندگی صدر صاحب آپ کی ہے۔ لہٰذا قول حق کہنے میں نہ مجھے مداہنت اختیار کرنی چاہیئے اور نہ ہی آپ کو اس پر سنجیدگی سے غور و خوض کرنے میں تامل کرنا چاہیئے۔ آپ سوچئے کہ آپ اللہ تعالےٰ کے ہاں اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ آپکے عہد حکومت میں پاکستان میں خواتین کی ہاکی کی ٹیم تیار ہو رہی ہے۔ اور ایسے معاملات میں قدم پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ سیلاب کا رُخ موڑیں اور معاشرے سے وہ طور طریقے ختم کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے دین کی رو سے بُرائیاں ہیں اور ہماری اخلاقی اقدار کے قطعی منافی ہیں۔ خدا نے آپ کو اس کا موقع دیا ہے۔ سیاسی باتیں میں اس موقع پر کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ہر چیز کا اپنا ایک مقام ہے۔ ویسے بھی میں عرض کر چکا ہوں کہ میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں اور میں اپنی زندگی دینِ مُبین اور اللہ تعالےٰ کی کتاب قرآن حکیم کی خدمت کے لئے وقف کر چکا ہوں۔ میری یہ حقیر اور ناچیز کوششیں میرے لئے کسی درجہ میں بھی توشۂ آخرت جائیں تو یہی میرے لئے سب سے بڑی سعادت ہے۔ لیکن میں اپنا دینی فرض سمجھتا ہوں کہ مجھے کتاب و سُنت سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ نبی اکرمؐ کے قول مبارک کہ "الدین النصیحہ" کی تعمیل میں آپ کی دینی و دنیوی خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دوں۔ حجاب کے احکام ہماری شریعت کے جزوِ لاینفک ہیں۔ اُمہات المومنینؓ

کے لئے سورہ احزاب میں جو احکام آئے ہیں۔ وہ محض تلاوت کے لئے نہیں ہیں بلکہ عمل کے لئے ہیں۔ جیسے ہمارے مردوں کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُسوۂ حسنہ ہیں۔ ہماری خواتین کے لئے بھی تو اُسوہ چاہیئے تھا سورۂ احزاب ہی میں یہ آیت آئی ہے " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ "۔ بلاشبہ اے مسلمانو! تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ ایک بہترین وکامل نمونہ ہے۔ اب خواتین کے لئے بھی تو ایک اُسوہ حسنہ چاہیئے تھا۔ خواتین کی زندگی کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں، جن کے لئے نبی اکرمؐ کی زندگی اُسوہ نہیں بن سکتی۔ اس ضرورت کے لئے ہماری خواتین کے لئے اُسوہ ہے ازواجِ مطہرات کا۔ اسی لئے ازواج مطہرات سے قرآن مجید میں اسی سورۂ احزاب میں فرمایا گیا ہے کہ " يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ "[1] "اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو"۔ یعنی تمہیں تو اُمت کی خواتین کے لئے نمونہ بننا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ " اگر تم میں سے کسی نے کوئی غلط حرکت کی تو اُسے دہری سزا دی جائے گی"[2] اور " تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی اس کو ہم دوہرا اجر دیں گے"[3]۔ ازواج مطہرات کو جو تنبیہہ کی گئی اور جو بشارت دی گئی ہے تو یہ معاملہ ہمارے غور وفکر کا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان آیات پر تدبر کریں اور ان سے جو ہدایات اخذ ہوں ان پر عمل پیرا ہونے اور دوسروں سے عمل کرانے کی حتی الامکان اور حتی الوسع کوشش کریں۔ مجھے اندازہ ہے کہ انگریز کی غلامی اور دوسرے اسباب سے ہمارے معاشرے کی ذہنی داخلاقی اقدار وروایات میں زبردست انحطاط آیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری معیشت کا ایسا ڈھانچہ بن گیا ہے، جس میں عورتیں معاشی میدان میں کام کر رہی ہیں۔ ان کا مسئلہ کافی پیچیدہ ہے لیکن میں عرض کروں گا کہ Where there is a will there is a way
یعنی عزم مصمم ہو اور یہ ارادہ کر لیا جائے کہ یہ کام کرنا ہے اپنی روایات اور اپنے دین کی تعلیمات کو اختیار کرنا ہے تو ان شاء اللہ راہ آسان ہو جائے گی۔

تیسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ صدر ایوب مرحوم کے دور میں جو عائلی قوانین نافذ کیے گئے تھے، ان کو پاکستان کے ہر مکتب فکر کے علماء کرام نے غلط قرار دیا تھا۔ لیکن آج بھی ان کو تحفظ حاصل ہے۔ خدا کے لئے سوچئے کہ جو قوانین بالاتفاق شریعت سے متصادم ہیں، وہ کیوں نافذ رہیں؟ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لے اور آپ

[1] آیت ۳۲ ، [2] آیت ۳۰ ، [3] آیت ۳۱)

اس ملک کی تاریخ میں ایک عظیم شخصیت کا مقام حاصل کریں ۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے لوگ پہلے بھی اقتدار میں آئے ہیں ۔ اللہ تعالےٰ نے ان کو مواقع دیئے ۔ بدقسمتی سے وُہ محرُوم رہ کر اس دنیا سے چلے گئے ۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کا نام بھی ایسے لوگوں میں شامل ہو ۔ لہٰذا میری مخلصانہ اپیل ہے کہ جو مواقع آپ کو حاصل ہیں، ان کو غنیمت سمجھا جائے ۔ تبدیلی اور اصلاح کے کام کا آغاز چھوٹی چھوٹی سی باتوں ہی سے کیجئے ”قطرہ قطرہ بہم شود دریا“ —— میں نے کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کے سامنے رکھی ہیں ۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ جو قول حق ہے اس کو سنیں ۔ اور قرآن حکیم کے ان الفاظ مبارکہ کا کامل مصداق بنیں : اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ ؕ یعنی جو صحیح بات بھی آپکے گوش گذار ہو ۔ اس کو عزم مصمم اور بہترین طریق سے روبعمل لانے کی توفیق پائیں ۔ آمین یارب العالمین ۔

(بقیہ عرض احوال)

گذرتے رہے ، گویا ع: ۔ ”ہر صبح سفر ، ہر شام سفر“ کا معاملہ رہا ۔

عربی زبان میں ’سفر‘ کے اصل معنی ”کشف الغطاء“ (راغب) کے ہیں یعنی پردے ہٹیں اور اصل حقائق منکشف ہوں ، اسی لئے کتاب جو لاعلمی کے پردوں کو چاک کرکے معلومات کے دائرے کو وسیع کرنے کا ذریعہ بنتی ہے ”سفر“ کہلاتی ہے اور صبح کے روشن ہوجانے پر ”اسفار“ کا اطلاق ہوتا ہے (وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ) زمین میں گھومنے پھرنے (فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ) کو بھی سفر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے نئے مشاہدات کا موقع ملتا ہے اور معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے ، اور بسا اوقات بالکل نئے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے —— راقم کو اعتراف ہے کہ امریکہ کے گذشتہ اور موجودہ سال کے دَوروں سے بہت سی نئی معلومات بھی حاصل ہوئیں اور دُور بیٹھ کر محض ’سمع‘ کی بنیاد پر جو تصورات ذہن میں قائم تھے ان میں سے بعض میں کسی قدر تبدیلی بھی آئی (شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ!) —— چنانچہ راقم نے سفر سے واپسی پر جمعہ ۲۴ ، اکتوبر کو مسجد شہداء میں درس قرآن کے بجائے اپنے سفر امریکہ کے مشاہدات اور تاثرات تفصیلاً بیان کئے تھے ، یہ تقریر بھی ٹیپ سے اتار لی گئی ہے اور ان شاءاللہ آئندہ شمارے میں شائع کردی جائے گی ۔ سفر امریکہ کی ایک حسین یاد یو این او کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں صدر پاکستان محترم محمد ضیاالحق صاحب کی تقریر کے موقع پر حاضری کی بھی ہے ، اس کے ضمن میں بھی راقم کے تاثرات

([illegible])

انفاق فی سبیل اللہ

ایک نشری تقریر —— ڈاکٹر اسرار احمد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۲۷۴

"وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال رات اور دن، خفیہ طور پر بھی اور علی الاعلان بھی ان کا اجر ان کے رب کے پاس (محفوظ) ہے اور ان کو نہ کوئی ڈر ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے!"

ابھی آپ نے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۴ مع ترجمہ سنی، جو انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں مال صرف کرنے سے متعلق دو رکوعوں سے بھی زاید پر پھیلی ہوئی ایک نہایت جامع بحث کی آخری کڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لئے مال صرف کرنا اسلام کی بنیادی تعلیمات اور قرآن حکیم کے اساسی مضامین میں سے ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صرفِ مال کی دو بڑی بڑی مدیں ہیں۔ ایک یتیموں، بیواؤں، محتاجوں، مسکینوں اور دوسرے امداد و اعانت کے مستحق لوگوں کی حاجت برآری میں مال خرچ کرنا جس میں غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینا اور مقروضوں کو قرض

کے بوجھ سے نجات دلانا بھی شامل ہے اور دوسرے دین کی تبلیغ و اشاعت اور اللہ کے کلمے کی دنیا میں سربلندی اور دین حق کے غلبہ و اظہار کی جدوجہد میں مال کھپانا۔ جو گویا جہاد فی سبیل اللہ کا اہم جزو ہے۔

پہلی مد میں مال کے صرف کرنے کو قرآن کہیں تو محض اعطاء کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے کہیں ایتاءِ مال سے۔ لیکن اس کے لئے اصل اصطلاحیں صدقہ اور زکوٰۃ ہیں صدقہ اس اعتبار سے کہ یہ انسان کے سچے معنی میں شریف، نیک اور صاحب مروت ہونے اور اس کے سچائی کے ساتھ اللہ تعالےٰ اور اس کے وعدۂ جزا اور وعیدِ سزا پر یقین رکھنے کی علامت اور دلیل ہے اور زکوٰۃ اس اعتبار سے کہ یہی انسان کے تزکیہ نفس کا سب سے موثر طریقہ اور دل کو دنیا کی محبت کی نجاست سے پاک کرنے کا سب سے کارگر ذریعہ ہے۔

دوسری مد میں مال خرچ کرنے کو قرآن بالعموم "جہاد بالمال" سے تعبیر کرتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں جہاد کا حکم اکثر و بیشتر ان الفاظ میں وارد ہوا ہے کہ "وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ" یعنی جہاد کرو اللہ کی راہ میں اور کھپاؤ اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی، اسی کو بہت سے مقامات پر اللہ کے ذمہ قرض حسنہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور جا بجا سوالیہ انداز میں ترغیب دلائی گئی ہے کہ "مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا" کون ہے وہ جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟ یہ اسلوب اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ واقعتاً انسان کو مال بہت محبوب ہے اور اس کا صرف اس پر فطرتاً گراں گزرتا ہے۔ غالب نے اسی انداز میں کہا ہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد!

لیکن اس مد کے لئے قرآن کی سب سے کثیر الاستعمال اور جامع ترین اصطلاح، "انفاق فی سبیل اللہ" ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کا ایک اہم شعبہ اور ضروری جزو ہے۔

اس اعتبار سے جہاد اور انفاق تقریباً مترادف الفاظ بن جاتے ہیں اور جہاد بالمال والنفس یا انفاقِ جان و مال اور بذلِ مال و نفس دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

سورۂ بقرہ میں چھتیسویں رکوع کے آغاز سے انفاق فی سبیل اللہ کا مضمون شروع ہوتا ہے اور مسلسل دو رکوعوں تک اسی بحث کے مختلف پہلوؤں پر کلام ہوا ہے چنانچہ اس کی اہمیت، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت، اس کی جزار، اس کے بارگاہِ الٰہی میں قبول ہونے کی شرائط یعنی خلوص و اخلاص، اس کے حبط اور ضائع ہوجانے کے اسباب یعنی ریار اور جتلانا، اس کے لیے بہتر اور بیشتر مال نکالنا نہ کہ کم تر اور کہتر، اس کا اظہار اور اخفار دونوں کا اپنے اپنے محل پر صحیح ہونا اور اس کا بہترین مصرف یعنی یہ کہ ایسے لوگوں پر خرچ کیا جائے جو اللہ کے دین کی خدمت اور اس کے پیغام کی نشر و اشاعت میں اس درجہ مشغول ہوگئے ہوں کہ اپنی معاشی جدوجہد کے لئے کوئی وقت نہ نکال پائیں۔ الغرض انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق جملہ امور پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ جامع آیت گویا ٹیپ کے بند کے طور پر آتی ہے جو آغاز میں تلاوت کی گئی تھی جس میں انفاق فی سبیل اللہ کے دوام پر بھی زور دیا گیا۔ یعنی یہ کہ یہ انفاق رات دن کرتے رہنا چاہیئے، اخفار و اظہار دونوں کی پسندیدگی کا اعلان بھی فرما دیا گیا۔ یعنی یہ کہ سِرّاً ہو یا علانیۃً دونوں بارگاہ خداوندی میں مقبول ہیں۔ اس کی اُخروی جزار کے قطعی اور یقینی ہونے کا بھی اطمینان دلا دیا۔ یعنی یہ کہ اس کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ اُمید بھی دلا دی کہ اس کے ذریعے انسان وہ مقام حاصل کرسکتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اسے نہ کوئی خوف رہے نہ حزن بلکہ سکون ہی سکون ہو اور چین ہی چین۔ گویا کہ یہ اشارہ کر دیا گیا کہ اس انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے انسان مرتبۂ ولایت حاصل کرسکتا ہے اس لئے کہ یہ شان صرف اولیار اللہ ہی کی ہے کہ "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ہر مسلمان پر

حسب صلاحیت و استعداد

قرآن مجید

کے مندرجہ ذیل پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں

① ـــــ ایمان و تعظیم ـــــ یہ کہ اُسے مانے

② ـــــ تلاوت و ترتیل ـــــ یہ کہ اُسے پڑھے

③ ـــــ تذکّر و تدبّر ـــــ یہ کہ اُسے سمجھے

④ ـــــ حکم و اقامت ـــــ یہ کہ اُس پر عمل کرے

⑤ ـــــ تبلیغ و تبیین ـــــ یہ کہ اُسے دوسروں تک پہنچائے

ان حقوق سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے
جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شہرۂ آفاق تالیف

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

کا مطالعہ اِن شاء اللہ العزیز بے حد مفید ہوگا

الحمد للہ کہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی دو اہم تصانیف جنکا شدت سے انتظار تھا طبع ہو گئی ہیں!

(۱)

اسلامی ریاست

مشتمل بر

- چند بنیادی مباحث
- شہریت کے حقوق و فرائض
- غیر مسلموں کے حقوق
- اطاعت کے شرائط اور حدود
- کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف

۱۸ × ۸/۲۲ کے ۳۷۶ صفحات اعلیٰ سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت

مجلد مع ڈسٹ کور : قیمت -/۲۰

(۲)

پاکستانی عورت

دور اہے پر

صفحات ۱۸۴ : قیمت -/۱۰

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

۳۶ رکے، ماڈل ٹاؤن - لاہور (فون: ۳۵۲۶۱۱)

اسلام اور پاکستان

خطرے اور خدشے، اور کرنے کے اصل کام

اسرار احمد

"میثاق" کی گذشتہ اشاعت میں بھی راقم الحروف کی ایک تقریر بعنوان "اسلامی نظامِ معیشت" شائع ہوئی تھی جو راقم نے اولاً چھٹی سالانہ قرآن کانفرنس منعقدہ کراچی (مارچ ۱۹۷۹ء) میں کی تھی۔ اسے ٹیپ سے اتار کر ایک رفیق نے خود ہی اپنے فہم و ذوق کے مطابق کچھ نوک پلک سنوار کر میری نظرِ ثانی کے بغیر شائع کر دیا تھا اس لئے کہ میں اس کی طباعت و اشاعت کے وقت ملک سے باہر تھا۔ اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں میں نے ایک مفصل تقریر "اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر بھی کی تھی جو ان ہی مراحل سے گذر کر میری واپسی پر کتابت شدہ صورت میں میرے سامنے آئی۔ اس میں اجمال و اختصار بھی کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے اور بعض مقامات پر ربطِ کلام بھی کچھ ٹوٹتا سا محسوس ہوتا ہے۔ تاہم بعض مفید باتیں ایک تسلسل کے ساتھ آ گئی ہیں۔ اور اسے از سرِ نو دوبارہ لکھنے پر طبیعت بھی آمادہ نہیں، لہٰذا سردست اسی صورت میں ہدیہ قارئین ہے۔ اسرار احمد

ملکی معاملات پر گفتگو کرنا اور ملکی استحکام کے بارے میں سوچنا ہر شہری کا فرض ہے۔ عام شہری کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ ملکی سالمیت کے تحفظ، ملک و ملت کی عزت اور اس کے وقار کے بارے میں غور و فکر کرے اور اگر اپنے ملک کو درپیش کسی خطرے اور خدشے کا اُسے احساس ہے تو اس سلسلے میں بھی جو کچھ وہ کر سکتا ہے کرے۔ اگر وہ ملک و ملت کو خطرات کے گرداب سے نکالنے کا کوئی فارمولا رکھتا ہے تو اہلِ وطن

کے سامنے پیش کرے ۔ علامہ اقبال کے بقول ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے ۔ کہ ہر شہری امن وسکون اور اطمینان کا خواہاں ہے ۔ اپنے لئے، اپنی آئندہ نسل کے لئے چین اور اطمینان کی خواہش کرنا ہر شخص کا فطری حق ہے ۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حقیقی امن وسکون اور اطمینانِ قلب کسی اور ہی چیز سے حاصل ہوتا ہے ۔ حقیقی اطمینان وسکون صرف انہیں میسّر آتا ہے جو دولت ایمان سے مالا مال ہوتے ہیں ۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی :

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

اگرچہ امن اور سکون کا حقیقی نسخہ یہ ہے لیکن عام انسانی سطح پر امن وسکون سے جو مراد لی جاتی ہے اس کے فقدان کے بارے میں تشویش بھی ایک بالکل فطری امر ہے، ہم امن وسکون کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کے استحکام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اس کا محرک یہ حقیقت ہوتی ہے کہ پاکستان، اسلام کے لئے وجود میں آیا اس لیئے اس کی بقا اور استحکام بھی اسلام سے وابستہ ہے ۔ اور اب تک کے حالات نے ثابت کیا ہے کہ کسی خدائی سکیم کے تحت ہی یہ ملک اب تک اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا ہے ۔ اس لحاظ سے جب کبھی مایوسی کے آثار پیدا ہوتے ہیں ۔ تو پھر ایک پاکستانی مسلمان دل مسوس کر رہ جاتا ہے ۔

وجہ اسکی یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس ملک سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں اور ہیں ۔ اُمید کا ایک ٹمٹاتا چراغ ابھی تک روشن ہے اگرچہ بار بار وہ مراحل آئے کہ جب مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھاتے محسوس ہوئے ۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ خدا تعالےٰ کا خاص فضل ہوا اور ملّی سفینہ گرداب میں آکر بھی نکلتا رہا جس سے اس حقیقت کا اظہار ہوا کہ اللہ تعالےٰ کی خاص مشیت کے تحت اس ملک کا مقدر اسلام سے وابستہ ہو چکا ہے ۔

چونکہ ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ اس ملک کا وجود اسلام کا مرہون منت ہے اور

یہ کسی نہ کسی وقت اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارا بنے گا اس لئے اگر اس پہلو سے ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچا جائے اور غور و فکر کیا جائے تو ہمارے نزدیک یہ ایک عبادت ہے۔ کیونکہ یہ صرف ملک اور قوم کا مسئلہ نہیں بلکہ دین کا مسئلہ ہے

یہ حقیقت تو اب کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ تنتیس سال گذر جانے کے باوجود بھی یہ ملک مستحکم نہیں ہو سکا بلکہ ایک ایسا وقت بھی ہم پر گذر چکا ہے کہ ملک کا نصف بہتر حصہ ہم سے جدا ہو گیا۔ اور جدائی ایسے افسوسناک طریقے سے عمل میں آئی کہ کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا عصمت دری کے واقعات ہوئے، ایک لاکھ کے قریب مسلمان ہندو کے قیدی بنے اور عذاب خداوندی کا وہ نظارہ ہوا جسے قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اویلبسکم شیعاً ویذیق بعضکم باس بعض۔ اس واقعہ سے نہ صرف ہم دو حصوں میں تقسیم ہوئے بلکہ ہماری قومی عزت اور ملکی وقار دونوں تباہ ہوئے۔ اس حادثے کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ ہم سنبھلتے اور اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لے کر آئندہ اُن سے بچنے کی تدبیر کرتے لیکن ہوا یہ کہ بچے کھچے ملک کو بھی ہم نے بازیچہ اطفال بنائے رکھا۔

یہ شاید دُنیا کا منفرد ملک ہوگا جس کے اہل سیاست نے بار بار اس خدشے کا اظہار کیا کہ یہ اب قائم نہیں رہ سکتا اور کوئی دن جاتا ہے کہ ملک پھر ایک اور تقسیم کا مزہ چکھے گا۔ اس بنا پر لوگوں کے ذہنوں میں ایک سوالیہ نشان ہے کہ اس ملک کا مستقبل کیا ہے۔ ع اور اسے کسی صورت استحکام حاصل ہو بھی سکتا ہے یا نہیں ؟

جب تک مرض کی صحیح تشخیص نہ ہو ظاہر بات ہے کہ اس کے علاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر مرض کے بارے میں کسی سطحی تشخیص پر اکتفا کر لیا جائے تو علاج بھی یقیناً سطحی قسم کا ہوگا جس سے مرض کے خاتمے اور انسان کی تندرستی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے خیال میں اب تک ملک کے مسائل کی صحیح تشخیص کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ علاج تو بہت دور کی بات ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان کے مسائل کا سب سے بڑا سبب ایک عُقدۂ لاینحل ہے۔ جب تک وہ حل نہیں ہوگا ہم مسائل اور مشکلات کی تنگناؤں میں بھٹکتے رہیں گے۔ وہ عقدہ یہ ہے کہ یہ ملک صرف مذہب کے نام پر قائم ہوا اور مذہب کے بغیر اس کا

استحکام تو بہت دُور کی بات ہے اس کا وجود بھی قائم نہیں رہ سکتا ۔ ہمارے اس دعوے علیے ہر عقل سلیم رکھنے والا شخص اتفاق کرے گا کہ اس کے وجود کے لئے کوئی ایسی ٹھوس بنیاد موجود نہیں جو آج کے دور میں کسی ملک کے وجود کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہے دین اور مذہب ہی ایسی چیز ہے جو اس ملک کے وجود کا جواز فراہم کرتی ہے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ یہی جنس اپنے حقیقی تقاضوں کے ساتھ یہاں مفقود ہے ۔ اس سلسلے میں ممکن ہے کوئی غلط فہمی پیدا ہو اس لئے ہم اپنے اس موقف کی مزید وضاحت ضروری سمجھتے ہیں ۔

جہاں تک اس ملک کے اسلام کے نام پر قائم ہونے کا سوال ہے دنیا میں شائد ہی کوئی شخص انشراح صدر کے ساتھ اس کا انکار کر سکے تحریک پاکستان میں لوگوں کی طرف سے جوش، جذبے اور ایک علیحدہ ملک کے مقام کے لئے قربانی اور ایثار کا مظاہرہ صرف اس لئے ہوا کہ وہ اسلام کی ایک تجربہ گاہ قائم کرنا چاہتے تھے ۔ انہیں "پاکستان کا مطلب کیا! لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے نے جمع کیا ۔

دراصل مسلمان کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے اس میں کسی ارضی تعلق کو کوئی تقدس حاصل نہیں ۔ مسلمانوں کا تو نعرہ ہی یہ رہا ہے ؎

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا تصوّر ایک عالمی وحدت اور اُمت کا ہے لیکن یہ تکلیف دہ حقیقت ہے کہ آج پوری دنیا میں ایسی متحدہ اُمت موجود نہیں بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ۔ علامہ اقبالؒ کو بھی جو مسلم اُمت کی وحدت ملی کے سب سے بڑے نقیب تھے یہ ماننا پڑا کہ اس وقت دُنیا میں ایک اُمتِ مسلمہ عملاً موجود نہیں بلکہ مسلمان اقوام پائی جاتی ہیں ۔

تاہم برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا نقطۂ نظر ہمیشہ آفاقی رہا ۔ تحریک خلافت اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے ۔ ایسی عظیم تحریک جس میں ہندو بھی شامل ہونے پر مجبور ہو گئے ۔ گاندھی کی اس تحریک میں شمولیت گو اپنے مقاصد کے لئے تھی لیکن اس سے تحریک کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اور اس تحریک سے برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنی افتاد کا پتہ چلتا ہے ۔

ایک اور دلیل جو وطنیت کے خلاف دی جا سکتی ہے اور جس پر ممکن ہے کچھ لوگ ناک بھوں چڑھائیں وہ سنجیدہ غور و خوض کا تقاضہ کرتی ہے خطۂ ارضی کی بنا پر کسی قوم کو تقدس حاصل ہو سکتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ کیا سندھ ایک خطۂ ارضی نہیں؟ بلوچستان ایک خطۂ ارضی نہیں؟ اگر پاکستان کی بنیاد پر ایک قوم وجود میں آ سکتی ہے تو پھر سندھ اور بلوچستان جو صدیوں سے ایک خاص زبان تہذیب و تمدن اور ثقافت کے مراکز چلے آ رہے ہیں کیوں نہ ایک علیحدہ قوم و ملک قرار پائیں؟

یہ ایک ایسا تصور ہے کہ جسے اگر قبول کر لیا جائے تو پھر پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ہم یہی مزا چکھ چکے ہیں وہاں ہمارے نوجوانوں کو لسانی و ثقافتی قومیت کا فلسفہ پڑھایا گیا اور آخر دشمنوں نے اپنے مقاصد پورے

صرف مذہب دنیا میں ملکوں کی بقا و استحکام کے جو رائج الوقت عوامل ہیں وہ بیان ہو چکے ہیں۔ جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صرف مذہب ہی ایک ایسی بنیاد ہے جو ہمارے بقا و استحکام کی ضمانت بن سکتا ہے۔ اب ذرا اس پس منظر میں جائزہ لیجئے کہ یہاں مذہب اور دین کی حالت کیا ہے۔ جذبات، نعروں اور تحریکوں کی افادیت کا انکار کئے بغیر یہ ایک حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے وقت بھی اور آج تک چلنے والی مختلف تحریکوں میں بھی مذہب نے موثر کردار تو ادا کیا ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن پورے وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کسی تحریک میں بھی مذہب، مقصدِ اوّلین اور نصب العین نہ تھا۔ ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ مذہب اور دین کے لئے چلائی جانے والی تحریکوں میں وہ افراد بھی قیادت میں شامل ہوں جو کبائر کے مرتکب ہی نہیں عادی ہوں اور جو فرائض کی ادائیگی سے بھی واقف نہ ہوں،

دیکھنا یہ چاہیئے کہ حقیقت کیا ہے صرف سطحی اور سرسری طور پر مطالعہ کرنے سے حقائق تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ گہرائی میں جائیں تو درج ذیل تلخ حقائق کرنا پڑتا ہے۔

(۱) اسلام اسلام اس حقیقت کا مظہر خارجی ہے جسے اہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ و رسول، کتب اور فرشتوں پر ایمان

اور آخرت پر یقین ہی اسلام کی بنیاد ہے اس ایمان اور یقین کے مظاہر نماز، روزہ حج، زکواۃ، حلال وحرام کی قیود کو ملحوظ رکھنا اور دیگر سماجی وتہذیبی احکام ہیں، اس اعتبار سے ہم اپنا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہم مذہب اور دین کے معاملے میں کسی قدر بے حس اور اس پر عمل کے سلسلے میں کس قدر عافیت کوش اور عمل سے دور بھاگنے والے ہیں۔

ہم اس معاشرے کو چار دائروں میں تقسیم کرکے اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بڑا دائرہ نظر آتا ہے ہماری قوم کا ۹۰٪ یہی دائرہ ہے۔ جس کا دین اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

نماز سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کن حقائق کی بنا پر ۹۰٪ مسلمان عوام کو اسلام سے بیگانہ قرار دے دیا گیا۔ اس سلسلے میں اپنی طرف سے کوئی پیمانہ مقرر کرنے کے بجائے سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پاک کو بطور پیمانہ ہم آپ کے سامنے پیش کریں گے ارشاد ہے۔

الفرق بین المسلم والکافر	کافر اور مسلمان کے درمیان فرق
ترک الصلوٰۃ	کرنے والی چیز نماز پنجگانہ ہے۔

اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اس ملک میں اس پیمانے پر پورا اترنے والوں کی تعداد کیا ہے۔ آپ جس طرف بھی نظر دوڑائیں گے آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ہمارے عوام کی عظیم اکثریت نماز پنجگانہ کی پابند نہیں ہے بلکہ اسے پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہیں دیتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد گرامی ہے۔

من ترک ثلثۃ صلوٰۃ	جس شخص نے تین جمعہ بغیر عذر کے
الجمعۃ بغیر عذرٍ لیختمن	ترک کئے اللہ اس کے دل پر مہر
اللہ علی قلبہ	کر دے گا۔

"ختم قلوب" کی یہ بدترین سزا اُن فاسقوں اور فاجروں کو ملتی ہے جن سے ایمان کی طرف آنے کی کوئی توقع باقی نہیں رہتی۔ مایوس العلاج مریضوں کے بارے میں فرمایا گیا۔

ختم اللہ علی قلوبھم وعلی	مہر کر دی ہے اللہ نے ان کے دلوں

سمعھم وعلی ابصارھم	اور کانوں پر اور اُن کی آنکھوں
غشاوۃ ولھم عذاب	پر پردے پڑ چکے ہیں۔ اس لئے
الیم ۳	ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اگر پیمانہ یہی ہے تو پھر نتیجہ بھی وہی ہے جو ہم نے نکالا ہے کہ اس قوم کی ۹۰٪ آبادی اسلام سے یکسر بیگانہ ہے۔

متوسط طبقہ دوسرے دائرے میں ہمارا متوسط طبقہ آتا ہے۔ جس میں خاصی بڑی تعداد کاروباری حضرات کی ہے جن مذہب کے ساتھ روائتی لگاؤ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انہی کے دم سے مسجدیں آباد ہیں اور دارالعلوم چل رہے ہیں۔ لیکن ان کا تصورِ مذہب بھی بس چند رسومات کی ادائیگی تک محدود ہے۔ شادی، بیاہ، تجارت اور لین دین غرض یہ کہ معاشی، معاشرتی ہر معاملے میں اپنی مرضی کرنا ہے، زمانے کی روش کے ساتھ چلنا ہے البتہ نماز روزہ کر لینا ہے اور بس نماز روزے، حج کے محسوس نتائج ان کی زندگیوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ مثلاً ایک شخص حاجی ہے لیکن اوّل درجے کا بلیک مارکٹر مشہور ہے۔ ایک شخص نماز پڑھتا ہے لیکن سنگدلی میں اپنی مثال آپ ہے

حاجی بلیکیا میں جن دنوں میں پریکٹس کیا کرتا تھا وہاں ایک صاحب تھے جو حاجی بلیکیا کے نام سے مشہور تھے اسی طرح ایک دوسرے صاحب کو "حاجی رشوت" کہا جاتا تھا۔ یہ "حاجی رشوت" صاحب محکمہ انکم ٹیکس اینڈ ایکسائز میں ملازم تھے۔ لمبی سی داڑھی، پانچ وقت کے نمازی لیکن رشوت خوب لیتے اور اسی رشوت سے مسجدوں کو چندے بھی دیتے تھے اور ناجائز دباؤ کے ذریعے اور کام بھی چلاتے تھے۔ اپنی سوسائٹی میں وہ "حاجی رشوت" کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے ہمارے خیال میں نوجوانوں کی مذہب سے بغاوت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ایسے لوگ بھی ہیں۔ کیونکہ جب مذہب ان کے حوالے سے جانا جائے گا جن کا مکروہ کردار سب کے سامنے ہے تو پھر مذہب کے خلاف بغاوت کیسے جراثیم کیوں نہیں پیدا ہوں گے۔

تیسرا طبقہ یہ ذرا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو تیسرے دائرے میں آتا ہے ان کا تصورِ مذہب خاصہ وسیع ہے یہ دین کو پارلیمنٹ، عدالت

عظمیٰ، گھر، بازار، تجارت، لین دین، بین الاقوامی معاملات اور پھر انفرادی معاملات کا دین سمجھتے ہیں۔ ان کے دلوں میں تمنائیں ہیں۔ یہ دین کے ہمہ گیر نظام کو دنیا پر غالب کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے اندر یہ انقلاب برپا کرنے میں بہت سے بزرگوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن نمایاں ترین نام علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ کے ہیں۔ یہ طبقہ ذہنی طور پر وسیع النظر تو ہے لیکن دین فہمی اور چیز ہے اور اُسے غالب کرنے کے لئے، جدوجہد کا جذبہ اور چیز۔ اس طبقے میں اس کی کمی ہے۔ یہ دنیا میں دین کا غلبہ تو چاہتے ہیں لیکن کسی اور کے ذریعے سے۔ یہ خود جدوجہد کرنے اور قربانی دینے کے لئے تیار نہیں۔ یہ اپنی دُنیا میں مگن رہنا چاہتے ہیں۔ البتہ جو تحریکیں دین کے غلبے کے لئے کام کرنا چاہیں یہ انہیں چندہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی انہیں گوارا نہیں مرغن کھانے کے بعد محض حدیثِ مائدہ کے طور پر دین کا مرثیہ پڑھیں گے اور غم و غصہ کا اظہار کریں گے کہ یوں نہیں ہو رہا اور دوں نہیں ہو رہا۔ مگر اُن کی تمام تر صلاحیتیں، تمام اوقات صرف دنیا اور اس کے اموال و اسباب اور لذتوں اور آسائشوں کے حصول کے لئے وقف ہیں۔

مذہبی قیادت چوتھا دائرہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو مذہب کے انقلابی جذبے سے سرشار ہیں وہ مختلف جماعتوں اور گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں اور قابل قدر کام کر رہے ہیں لیکن افسوس کہ وہ معاشرے میں مؤثر کردار کے حامل نہیں۔ ان میں سے جو سیاست میں آگئے ہیں وہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں یہ ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکتے اِلّا آنکہ کبھی کوئی منفی مقصد انہیں ایک جگہ جمع کر دے۔

ایمان کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ جہاں تک نیّت کا تعلق ہے کوئی شخص کسی کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یقین کی دولت سے سرشار ایمان کا کردار پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے قانونی سطح پر اپنے آپ کو منوا لینا اور بات ہے اور اپنے کردار سے اس کا ثبوت پیش کرنا چیزے دِگر۔ ایمان اگر صرف موروثی عقیدہ نہیں بلکہ شعور و ادراک کے ساتھ کچھ ذمہ داریوں کو قبول کرنے کا نام ہے۔ تو پھر اس کا

عملی مظاہرہ ہونا چاہیئے - لیکن یہاں خدا، رسول اور آخرت کو زبانی طور پر مان لینے کا نام ہی ایمان ہے -

میرے خیال میں کسی ملک اور معاشرے میں وہ طبقہ ہی لائق اعتنا ہوتا ہے جسے "ذہین اقلیت" (INTELLECTUAL MINORITY) کہتے ہیں - چونکہ اس طبقہ کے ہاتھ میں ملک اور معاشرے کی زمام کار ہوتی ہے اس لئے اُس کا ایمان مؤثر ہوتا ہے - کیونکہ یہ معاشرے کا انجن ہوتے ہیں

ہمارے یہاں جو نظام تعلیم ہے اس کے نتیجے میں دینی مدارس سے تو یہ طبقہ آتا نہیں گو کہ دینی مدارس کی یہاں ایک بڑی تعداد موجود ہے اور ایمان و یقین کی سب سے زیادہ شہادت انہی اداروں سے ملنی چاہیئے -

جملہ معترضہ لیکن اگر اسے گستاخی نہ سمجھا جائے تو میں کہونگا کہ یہاں سبھی معاملہ کالجوں، یونیورسٹیوں سے چنداں مختلف نہیں - یقین کی شمعیں شاذ ہی کہیں روشن رہ گئی ہیں جیسے کی جو اہمیت کسی دوسرے طبقے میں ہے وہ یہاں بھی ہے - ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں کالجوں میں جو رسہ کشی ہوتی ہے وہ یہاں بھی موجود ہے - اس کے باوجود ان کی اپنی اہمیت ہے اگر یہ دارالعلوم، یہ دینی ادارے موجود نہ ہوں تو یہاں دین کی جو تھوڑی سی روشنی ہے وہ بالکل ہی ختم ہو کر رہ جائے -

بہرحال جہاں تک کالجوں یونیورسٹیوں کا تعلق ہے تو یہ معاملہ ہے ہی کہ:

؎ گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدائے لا الٰہ الا اللہ

یہاں جس قسم کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے اس کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کا یہ تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے کہ:-

"اس نظام تعلیم سے گذرنے کے بعد بھی اگر کسی کے دل کچھ ایمان اور دین کے ساتھ تعلق باقی رہ جائے تو ایسا شخص یا پیدائشی ولی ہے یا پھر بالکل غبی"

ہمارے ان تعلیمی اداروں میں جو لوگ سائنس، (فزکس، کمسٹری) پڑھتے ہیں

بائیکنالوجی تو وہ اس قدر متاثر نہیں ہوتے لیکن جو "انسانی علوم"، فلسفہ، تاریخ، نفسیات، لٹریچر، اخلاقیات وغیرہ پڑھتے ہیں انہیں کفر سے بچانا آسان نہیں۔ کوئی فرائڈ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہے۔ کسی کو ہیگل کے فلسفے سے عشق ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان لوگوں نے ہی ملکی قیادت سنبھالنی ہوتی ہے۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کردہ اس ملک میں اسلام کا عقیدہ و عمل مطلوبہ صورت میں موجود ہے۔ موروثی اور خاندانی روایات کا نام اسلام ہو تو اور بات ہے ورنہ یہاں کا پورا نظام حیات جس انداز میں قائم ہے اس میں حقیقی مذہب کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ایک طرف یہ حقیقت کہ پاکستان کے بقا اور استحکام کا دار و مدار اسلام پر ہے اور دوسری طرف مذہب سے ہمارا تعلق بس اس قدر کہ یہ کہنا ہرگز غلط نہیں ہے کہ ع ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ جب تک اس صورت حال کو تبدیل نہیں کیا جائے گا ملک کا مستقبل مخدوش ہی رہے گا۔

لیکن تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ مسلمان چودہ سو سال میں دو مرتبہ عروج کی طرف جا کر پستیوں میں گرے ہیں۔ ہمارا پہلا عروج عربوں کی قیادت میں تھا۔ پھر زوال آیا۔ نوّے برس کے لگ بھگ یروشلم پر عیسائیوں کا قبضہ، صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کا قتل عام، اور پھر فتنۂ تاتار کی تباہ کاریاں۔ یہ سب ہمارے زوال کی آخری حد تھی۔ خلافت عباسیہ ختم ہو گئی اور عالم اسلام کا نقشہ وہ بنا جسے قرآن مجید نے عزیر علیہ السلام الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بیت المقدس کو دیکھ کر عزیر علیہ السلام نے فرمایا: اَنّٰی یُحۡیٖ ہٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا

عالمِ اسلام بدترین انتشار کی زد میں تھا طوائف الملوکی اور لامرکزیت کا دور دورہ تھا لیکن پھر ہمارے اقتدار کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

عربوں کے دَور میں مسلمان فرانس تک پہنچے ہیں تو ترکوں نے اٹلی کے دروازے پر دستک دی ہے۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ اور تجدید علوم کی جو تحریک چلی وہ

مسلمانوں کی رہین منت ہے

پھر جو دورِ زوال شروع ہوا ہے تو مغربی استعمار نے انڈونیشیا، ملائشیا، ہندوستان سب کو چھین لیا، مسلمانوں کی وحدتِ ملّی پارہ پارہ ہوگئی۔ عربوں کو تقسیم کیا گیا اور مولانا حالی پکار اُٹھے ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دُعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

اور ؎

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اس کے بعد ملاحظہ فرمایئے تاریخ کا ایک رُخ روشن۔ ایک ہمہ جہتی احیائی عمل شروع ہوتا ہے۔ مختلف تحریکیں اُٹھیں اور مختلف مسلم ممالک میں اُبھریں۔ سب سے پہلے مغرب سے براہ راست غلامی کا خاتمہ ہوا۔ جہاں جہاں مغرب کا تسلّط تھا ختم ہوا اور آزادی مل گئی۔ آزادی کی ان تحریکوں کے ضمن میں ایک حقیقت بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ کسی دوسرے مسلمان ملک کی آزادی کی تحریک میں مذہب نے فیصلہ کن کردار ادا نہیں کیا سوائے برصغیر کی تحریک آزادی میں کہ مذہب کے نام پر علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ پھر یہ کہ اس خطۂ ارضی کے قیام میں جو فکر کارفرما ہے وہ بھی سلامی فکر ہے جس کے داعی علامہ اقبال تھے بلکہ یہاں فکر ولی اللہ کارفرما ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اس ملک کا قیام بھی ایک معجزہ تھا اور اب تک اس کا قائم رہنا بھی ایک معجزہ ہے ورنہ مسلم لیگ تو کینٹ مشن پلان کو تسلیم کر چکی تھی اس کے بعد بھی ایک اور موقع آیا جب ہماری قیادت نے آزاد پاکستان سے ایک طرح کی دستبرداری اختیار کر لی تھی جب ایوب خان نے ہندوستان کو مشترکہ دفاع کی پیشکش کی۔ وہ تو ہندو کی مت ماری گئی۔ اور پنڈت نہرو نے

اُسے ٹھکرا دیا ورنہ مشترکہ دفاع کی صورت میں بالادستی ۶۰ کروڑ کے ملک بھارت ہی کو ہوتی۔

پھر ۱۹۶۵ء میں جو کچھ ہوا اُسے ذہن میں رکھیئے کہ سوائے معجزہ کے کیا چیز تھی جس نے ہمیں سرخرو کیا۔ سیکولرزم کے اس دور میں پاکستان میں ایک طبقے کو خالص مذہب کے نام پر اقلیت قرار دینا بھی اس سلسلے کی کڑی ہے اور وہ بھی اس حکومت کے ہاتھوں جو سیکولر ذہن کی مالک تھی۔

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خدائی پروگرام ہے جو ملک کو باقی رکھنے کے حق میں ہے۔ ہم اس سلسلے میں جو کردار ادا کر سکتے ہیں وہ ہمارا فرض ہے۔ یہاں ایک ہمہ جہتی احیائی عمل کی ضرورت ہے۔ جو روحانی، سماجی، علمی، فکری اور سیاسی غرضیکہ ہر سطح پر انقلابی خصوصیات کا حامل ہو۔

پہلا مرحلہ اس سلسلے کا سب سے پہلا مرحلہ تجدید ایمان کا ہے وہ ایمان و یقین جو مطلوب حقیقی ہے اگر ہمارے دلوں میں ہوتا تو ہماری حالت یہ نہ ہوتی۔ ہماری بہترین صلاحیتیں تجدید ایمان کی تحریک برپا کرنے پر صرف ہونی چاہئیں۔ اس ایمان کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ اس کے ذریعے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یقین پیدا کیا تھا۔

دوسرا مرحلہ دوسرے مرحلہ پر توبہ کی منادی ہو۔

یایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ النصوحا (سورۃ تحریم)

اے اہل ایمان! اللہ کی جناب میں توبہ کرو جو بالکل خالص اور بے لوث ہو!

ایسی توبہ جس سے ہم حلال و حرام کی تمیز سیکھیں اور اسے اختیار کریں اس کے لئے کچھ نقصان برداشت کرنا پڑے تو کریں، دنیوی آسائشوں سے دستکش ہونا پڑے تو ہوں پھر یہ منزل حاصل ہوگی۔

تیسرا مرحلہ تیسرے مرحلے میں ہمارے صلاحیتیں خواہ مخواہ کی مخالفت یا توڑ پھوڑ سے ہٹ کر اور دوسرے تمام مطالبات سے قطع نظر صرف ایک مطالبے پر صرف ہونی چاہئیں اور وہ اسلام نظام کے مکمل نفاذ کا مطالبہ

ہے ۔ حکومت کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اسلامی نظام کا مکمل نفاذ کرے ۔

جو لوگ ہمارے اس تجزیئے سے متفق ہوں انہیں سوچنا چاہیئے کہ وہ کیا کر سکتے ہیں وہ خود آگے بڑھیں اور اس راہ کو اختیار کریں جو تجدید ایمان توبہ اور رجوع الی القرآن کی راہ ہے کیونکہ اس سے ہی پاکستان کی بقا اور استحکام کی ضمانت مل سکتی ہے ۔ قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم سے ہی یہ معاملہ چل سکتا ہے ۔ ہم نے اس سلسلے میں حقیر سی کوششوں کا آغاز کر دیا ہے انجمن خدام القرآن کا مقصد قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم اور تنظیم اسلامی تجدید ایمان اور توبہ کے مقاصد کے تحت کام کر رہی ہے ۔ جو لوگ اس تنظیم میں منسلک ہونا چاہئیں تو بسم اللہ ورنہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک ہی جماعت ہو جو کام کی رہنمائی کرے ۔ اس کے لئے مختلف جماعتیں مختلف گروہ ہو سکتے ہیں

ضرورت اس امر کی ہے کہ اب پوری قوم اور خاص طور پر ذہین طبقے کی توجہ اس ایک مقصد کی طرف مبذول ہونی چاہیئے اور وہ ہے ملک کے استحکام اور بقا کا مقصد جو بغیر تجدید ایمان، توبہ اور قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم کے ممکن نہیں ۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ٥

(بقیہ سنہ ہجری از صـ۴۹)

السفلی وکلمة اللہ ھی العلیا واللہ عزیز حکیم (توبہ : ۴۰)	وطمانیت اس پر اتار دی اور فتح و نصرت کے ایسے لشکروں سے اسکی مدد کی جنہیں دنیا کی ظاہر

بیں اور حقیقت نا آشنا آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں نتیجہ یہ نکلا کہ ان سرکشوں کی بات جو انکار کرتے تھے ہمیشہ کے لئے پست ہو گئی اور کلمہ حق کی سربلندی اور کامیابی حاصل ہوئی ۔

یہ آیت سورہ براۃ کی ہے ۔ سورہ براۃ بالاتفاق اس وقت نازل ہوئی جب اسلام کی ظاہری فتح مندیاں تکمیل تک پہنچ چکی تھیں اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تمام فتح مندیوں کے ظہور کے بعد اسکی ضرورت باقی تھی کہ واقعہ ہجرت کی معنوی فتح مندی یاد دلائی جائے ۔

ہجرت اور سنہ ہجری کا آغاز[1]

مولانا ابوالکلام آزاد

سنہ ہجری کی ابتدا اسلام کے ظہور سے پہلے دُنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے زیادہ مشہور یہودی رومی اور ایرانی سنین تھے۔ عرب جاہلیتہ کی اندرونی زندگی اِس قدر متمدن نہیں تھی کہ حساب وکتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی۔ اوقات و مواسم کی حفاظت اور یادداشت کیلئے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اُس سے وقت کا حساب لگا لیتے۔ منجملہ سنین جاہلیتہ کے "عام الفیل" تھا۔ یعنی شاہ حبش کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال۔ عرصے تک یہی واقعہ عرب کے حساب وکتاب میں بطور سنہ کے مستعمل رہا۔ ظہورِ اسلام کے بعد اہمیت خود عہد اسلام کے واقعات نے لے لی۔ صحابہ کرامؓ کا قاعدہ تھا۔ کہ عہد اسلام کے واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اسی سے حساب لگاتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ہی سُورہ حج کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی۔ اذن الذین یقاتلون بانہم ظلموا وان اللّٰہ علیٰ نصرھم لقدیر۔ (حج: ۴۰) اس لئے کچھ دنوں تک یہی واقعہ بطور ایک سنہ کے مستعمل رہا۔ لوگ اِسے "سنہِ اذن" سے تعبیر کرتے اور یہ تعبیر وقت کے ایک خاص عدد کی طرح یادداشت میں کام دیتی۔ اسی طرح سورۂ براۃ کے نزول کے بعد بول چال میں "سنہ براۃ" کا بھی رواج رہا۔ عہد نبویؐ کا آخری سنہ "سنۃ الوداع" تھا۔ یعنی آنحضرت (صلعم) کے آخری حج کا واقعہ جو "حجۃ الوداع" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اور ہجرت کے دسویں سال پیش آیا تھا۔ بعض روایات سے اس طرح کے متعدد سنوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً سنۃ التمحیص، سنۃ الرفۃ، سنۃ الزلزال، سنۃ الاستیناس۔ بیرونی نے آثار الباقیہ میں اس طرح کے دس سنوں کا ذکر کیا ہے۔

[1] ماخوذ از "رسُولِ رحمت" مرتبہ مولانا غلام رسُول مہر۔

آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد کچھ عرصے تک یہی حالت جاری رہی لیکن حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالک مفتوحہ کی وسعت اور دفاتر حکومت کے قیام سے حساب وکتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوئے اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر کوئی ایک سنہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ اس معاملے پر غور کیا گیا۔ اور سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک واقعۂ ہجرت پر سولہ برس گذر چکے تھے۔

احساس ضرورت اور مشورہ

سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا تو کیوں حضرۃ عمرؓ اور تمام صحابہ کا ذہن اس طرف گیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا واقعہ ہجرت سے کی جائے۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک ضروری اور نتیجہ خیز مبحث تھا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نظر و فکر سے محروم رہا۔

اس بارے میں متعدد روایتیں منقول ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور روایت میمون بن مہران کی ہے۔ جسے تمام مورخین نے نقل کیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک کاغذ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا جس میں شعبان کا مہینہ درج تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ شعبان سے مقصود کون سا شعبان ہے۔ اس برس کا یا آئندہ برس کا؟ پھر آپ نے سربرآوردہ صحابہؓ کو جمع کیا۔ اور اُن سے کہا اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔ اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا لہٰذا ضروری ہے کہ حساب کتاب کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہیئے ان کے یہاں اس کے طریقے کیا تھے؟ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو بلایا۔ اس نے کہا: ہمارے یہاں ایک حساب موجود ہے جسے ماہ روز کہتے ہیں۔ اسی ماہ روز کو عربی میں مورخہ بنا لیا گیا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کے لئے جو سنہ اختیار کیا جائے۔ اس کی ابتدا کب سے ہو؟ سب نے اتفاق کیا کہ ہجرت کے برس سے کی جائے۔ چنانچہ ہجری سنہ قرار پایا۔

دوسری روایت

ابن حبّان نے قرہ بن خالد سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے اس میں ایک دوسرے واقعے کا ذکر

کیا گیا ہے ۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن سے ایک عامل آیا تھا۔ اس نے کہا لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے اس طرح کہ فلاں بات فلاں سنہ میں اور سنہ کے فلاں مہینے میں ہوئی اس پر حضرت عمرؓ اور لوگوں کو اس معاملے کا خیال ہوا ۔ پہلے انہوں نے ارادہ کیا کہ آنحضرت (صلعم) کے مبعوث ہونے کے وقت سے سنہ کا حساب شروع کر دیں ۔ پھر خیال ہوا کہ آپ کی وفات سے شروع کیا جائے لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ہجرت سے سنہ کا تقرر ہو ۔

ان روایات کی مزید تشریح امام شعبی کی روایت سے ہوتی ہے ۔ جو محب طبری نے نقل کی ہے ۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ : ۔

ان ابا موسیٰ الاشعری کتب	ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ
الی عمر انہ تاتینا منک	کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے
کتب لیس لھا تاریخ وقد	نام خطوط آتے ہیں ۔ مگر ان پر کوئی
کان عمر دون الدواوین	تاریخ نہیں ہوتی اور یہ وقت وہ
ووضع الاخرجہ واحتاج	تھا کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کے
الی تاریخ ولم یجب	مختلف دفاتر قائم کر دیئے تھے
التاریخات القدیمہ	اور خراج کے قواعد و اصول طے
فجمع علیہ عند ذالک	پا گئے تھے اور اس سے محسوس کر
واستشار الناس فاتفقوا	رہے تھے کہ ضبط اوقات کے لئے
علی ان یکون المبداء من	ایک خاص تاریخ قرار پانی چاہئے ۔ پرانی
الھجرۃ (ریاض النضرۃ)	تاریخیں موجود تھیں ۔ لیکن وہ

پسند نہیں کرتے تھے کہ انہیں اختیار کریں ۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے لکھا تو انہیں زیادہ توجہ ہو گئی ۔ صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا ۔ مشورہ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرت کا واقعہ بنیاد ٹھہرا کر سنہ ہجری اختیار کیا جائے ۔

حضرت علیؓ کی رائے ابو ہلال عسکری نے "اوائل" میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے

کہ واقعۂ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دی تھی وہ کہتے ہیں کہ :-

جمع عمر الناس فسألهم	حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ
من اي يوم يكتب التاريخ؟	کیا کہ کس دن سے تاریخ کا حساب
فقال علي ابن ابي طالب من	شروع کیا جائے؟ تو حضرت علیؓ نے
يوم هاجر رسول الله و	فرمایا اُس دن سے جس دن آنحضرتؐ
ترك مكه ففعله عمرؓ	نے ہجرت کی اور مکہ سے مدینہ آئے۔

(کتاب الاوائل قلمی و مقریزی طبع ثانی جلد ۲ صفحہ ۵۶)

یعقوبی نے بھی اسے منجملہ اُن اُمور کے قرار دیا ہے۔ جو حضرت علیؓ کی رائے سے انجام پائے سنہ ۱۶ کے واقعات میں لکھتا ہے۔

وفيها ارخ عمر الكتب	اسی زمانے میں حضرت عمرؓ نے ارادہ
واراد ان يكتب التاريخ	کیا کہ ضبط کتابت کے لئے
من مولد رسول الله ثم	ایک تاریخ قرار دی جائے پہلے
قال من المبعث فاشار	اُنہیں خیال ہوا آنحضرتؐ کی ولادت
عليه علي ابن ابي طالب	سے شروع کریں پھر خیال کیا کہ
ان يكتبه من الهجرت	آپؐ کی بعثت کے واقعہ سے ابتدا
فكتبهٗ من الهجرت۔	کی جائے لیکن حضرت علیؓ نے

رائے دی کہ ہجرت سے شروع کرنا چاہیئے۔

قومی سنہ کی ضرورت و اہمیت

ان روایات کے مطالعہ کے بعد ضروری ہے کہ بعض امور پر غور کیا جائے: سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور صحابہؓ نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی کہ ایک نیا سنہ قرار دیا جائے؟ امام شعبی کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ تاریخ کے تعین و تقرر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسری قوموں کی تاریخ اختیار کریں پہلی روایت میں جس ہرمزان کو بلانے اور

مشورہ کرنے کا ذکر ہے۔ یہ خوزستان کا بادشاہ تھا اور مسلمان ہو کر مدینہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی مجالس شوریٰ میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے۔ بیرونی لکھتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے نہ صرف ایرانیوں کا طریقہ ہی بتلایا بلکہ رومیوں کے طریقے کی بھی تشریح کی۔ ایرانیوں کے یہاں کا آخری سنہ یزدگرد کا سنہ تھا اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا تھا۔ بعض اصحاب کو خیال ہوا انہی دونوں میں سے کوئی سنہ اختیار کر لیا جاتے لیکن حضرت عمرؓ اور دیگر لوگ اس سے متفق نہ ہوئے اس سے معلوم ہوکہ ایرانیوں اور رومیوں کے سنین مجمع صحابہؓ میں زیر بحث رہے اور بعض نے اسے اختیار کرنے کی رائے بھی دی لیکن عام رجحان اس طرف تھا کہ نیا سنہ مقرر کرنا چاہیئے۔

اجنبی سنہ سے اجتناب کیوں؟

اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ سنہ کی ضرورت اور استعمال کی بڑی جگہ حساب وکتاب کے دفاتر تھے اور حضرت عمرؓ نے بہ اتفاق صحابہؓ، دفاتر کے لئے وہی زبانیں اختیار کر لی تھیں جو پیشتر سے مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں۔ ایران کے لئے فارسی شام کے لئے سریانی اور مصر کے لئے قبطی تھی ظاہر ہے کہ دفاتر کے لئے ایران وشام کی زبانیں اختیار کر لی گئیں تھیں تو قدرتی طور پر سنہ بھی وہی اختیار کر لینا تھا جو ان زبانوں کے حساب وکتاب میں رائج تھا اور اس کے قواعد بندھے چلے آتے تھے لیکن حضرت عمرؓ اور صحابہؓ نے ایسا نہیں کیا۔ ایران اور روم ومصر کی زبانیں اختیار کر لیں مگر سنہ اپنا قائم کرنا چاہا۔ غور کرنا چاہیئے۔ اس اجتناب کی علت کیا تھی؟

کشادہ دِلی کی روشن مثالیں

یہ علت تو قطعاً نہیں ہو سکتی کہ صحابہ کرامؓ محض قومی تعصب اور تنگ دلی کی بنا پر دوسری قوموں کی اچھی اور کارآمد باتوں سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ اوّلاً اس بارے میں خود اسلامی احکام کا یہ حال ہے کہ رکاوٹ کی جگہ صریح ترغیب دی گئی ہے۔ ثانیاً اس عہد کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے تعصبات کو اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنیت میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی وہ دنیا کے تمام علمی وتمدنی ذخیرے کو خواہ کسی قوم اور ملک سے

تعلق رکھتا ہو۔ اپنا قومی ورثہ سمجھتے تھے خود اس عہد میں حضرت عمرؓ نے بے شمار معاملات میں غیر قوموں کے علمی اور تمدنی اصول معلوم کئے ہیں۔ اور ان میں جو باتیں کار آمد اور ضروری نظر آئی ہیں بلا تامل اختیار کر لی ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا وہ ایرانیوں، رومیوں اور مصریوں کو بہ اصرار طلب کراتے اور اُن سے مشورہ لیتے۔ دفاتر حکومت کی تقسیم، خراج و محصول کا تعین، اراضی کی پیمائش اور تشخیص خزانے کا قیام حساب و کتاب کے اصول و قواعد اور اسی طرح کے بہت معاملات ہیں۔ جن میں ایرانی اور رومی قواعد کا تتبع کیا گیا۔ فقہ کا ایک اہم باب فرائض ہے۔ یعنی ورثہ کی تقسیم کے اصول و قواعد چونکہ اس کا تعلق فن حساب سے ہے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے چاہا اس کے قواعد کی ترتیب و درستگی کے لئے ایک ماہر حساب سے مدد لی جائے مورخین نے تصریح کی ہے کہ اس غرض سے ایک رومی مسیحی مدینہ میں طلب کیا گیا تھا۔ طلبی کے فرمان میں والیٔ شام کو جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ ہیں۔ ابعث لنا رومی یقیم لنا حساب فرائضنا ایک رومی کو بھیج دو تاکہ وہ ہمارے فرائض کا حساب استوار کر دے جب حضرت عمرؓ کو فرائض جیسے شرعی مسئلے کے حساب میں ایک رومی عیسائی سے مدد لینا ناگوار نہ ہوا۔ تو ظاہر ہے۔ کہ ایرانی یا رومی سنہ کے اختیار کر لینے میں قومی تعصب کیوں مانع ہوتا جس کا تعلق صرف حساب و تاریخ سے ہے۔ انہوں نے ایرانی اور رومی سنین جیسے مدون و رائج سنہ چھوڑ دیئے اور ایک نیا سنہ از سر نو قائم کیا۔

صحابہ کرامؓ کے دماغ کا سانچہ اصل یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرامؓ کا دماغ جس سانچے میں ڈھال دیا تھا وہ ایسا سانچا تھا جس میں دوسرے درجے کا کوئی خیال سما ہی نہیں سکتا تھا وہ صرف اوّل درجہ کے خیالات کے لئے تھا۔ بہت ممکن ہے۔ دنیا کے تمدنی علوم و فنون کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علمی طریقوں مصطلح لفظوں میں ادا نہ کر سکتے ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل و صورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے لیکن ان کی طبیعت کی اُفتاد اور ذہنیت کی روش کچھ اس طرح کی بن گئی تھی کہ

جب کبھی کسی معاملے پر سوچ بچار کرتے تھے تو خواہ علت و موجب سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں لیکن دماغ جاتا اُسی طرف تھا جو علم و حکمت کے لئے بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند پہلو ہو سکتے ہیں۔ یہی معنی ہیں انبیائے کرامؑ کے مقام تزکیہ کے کہ "ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ" (جمعہ: ۲) یعنی دل و دماغ کی اس طرح تربیت کر دی جاتی ہے کہ ایک موزوں اور مستقیم سانچہ ڈھل جاتا ہے۔ اب جب کبھی کوئی ٹیڑھی چیز اس میں رکھی جائیگی وہ قبول نہیں کرے گا اور موزوں چیزیں ہی اس میں سما سکتی ہیں۔

واقعہ ہجرت کا اختصاص

بہر حال اس معاملہ میں پہلی بات جو قابلِ غور تھی وہ قومی سنہ کا تقرر اور اُسکی اہمیت کا احساس تھا بغیر کسی دور دراز توجیہ کے اختیار کئے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ اور اکابر صحابہؓ کی اس پہلو پر نظر تھی وہ محسوس کرتے تھے کہ قومی زندگی کی تقویم کے لئے قومی سنہ ضروری ہے اور اس لئے چاہیئے کہ یہ باہر سے نہ لیا جائے اندر ہی طیار کیا جائے۔

اس کے بعد دوسرا اہم نقطۂ نظر واقعہ ہجرت کا اختصاص ہے۔ اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ سنہ کی ابتدا قرار دینے کیلئے جس قدر بھی سامنے کی چیزیں ہو سکتی تھیں ان میں سے کسی چیز کی طرف ان کی نگاہ نہ گئی ہجرت نبویؐ کا واقعہ جو آغاز اسلام کی بے سروسامانیوں اور کمزوریوں کی یاد تازہ کرتا تھا اختیار کیا گیا۔ آخر اس کی علت کیا تھی؟

مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لئے قدرتی طور پر جو چیزیں سامنے کی تھیں وہ اسلام کا ظہور تھا داعی اسلام کی پیدائش تھی نزول وحی کی ابتدا تھی بدر کی تاریخی فتح تھی۔ مکہ کا فتحمندانہ داخلہ تھا حجۃ الوداع کا اجتماع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل و فتح کا آخری اعلان تھا لیکن ان تمام واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی اختیار نہیں کیا گیا۔ ہجرت مدینہ کی طرف نظر گئی جو نہ تو کسی پیدائش کا جشن ہے۔ نہ کسی ظہور کی شوکت نہ کسی جنگ کی فتح ہے۔ نہ کسی غلبہ و تسلط کا شادیانہ بلکہ اس زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جب آغاز اسلام کی بے سروسامانیاں اور

ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کی داعی اسلام کے لئے اپنے وطن میں زندگی بسر کرنا بھی ناممکن ہوگیا تھا۔ بیچارگی اور مظلومیت کی انتہا تھی کہ اپنا وطن اپنا گھر اپنے عزیز و اقارب اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف ایک رفیق غمگسار کے ساتھ رات کی تاریکی میں وہ سیاردشتِ غربت ہوا تھا

واقعہ ہجرت کی اہمیت

اس بارے میں قوموں کا طریقہ اُن کے سامنے آیا اور خود اُنہیں بھی یہ بات صاف دکھائی دی کہ داعی اسلام کی پیدائش یا بعثت کو اپنی قومی تاریخ کی بنیاد ٹھہرائیں لیکن چونکہ یہ بات اس معیار نظر سے ہٹی ہوئی تھی جو اس طرح کے معاملات میں اسلام نے قائم کیا تھا اس لئے نہایت واضح اور نمایاں ہونے پر بھی ان کی طبیعت کو مطمئن نہ کر سکی وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ کوئی دوسری بات ہونی چاہیئے وہ دوسری بات کیا تھی؟ ہجرت مدینہ کا واقعہ جونہی یہ بات سامنے آئی سب کے دلوں نے قبول کر لی۔ تاریخ کا یہ مبدء دُنیا کی تمام تاریخوں اور یادگاروں کے خلاف تھا صرف خلاف ہی نہ تھا بلکہ صریح اُلٹا تھا۔ دُنیا کی تمام قومیں فتح و اقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں۔ انہوں نے بیچارگی اور درماندگی سے اپنی تاریخ شروع کی دنیا کی تمام قوموں نے چاہا اپنے ظہور کی سب سے بڑی فتح یاد رکھیں انہوں نے چاہا اپنی تاریخ ظہور کی سب سے بڑی بے سروسامانی یاد رکھیں دنیا کی تمام قوموں کا فیصلہ یہ ہے کہ اُن کی قومی تاریخ اس وقت شروع ہو جب ان کی تاریخ کا سب سے بڑا انسان پیدا ہوا اور اُس نے جنگ و قتال کے میدان میں فتح حاصل کی لیکن ان کا فیصلہ یہ تھا کہ قومی تاریخ کی ابتدا اس دن سے ہو جب سب سے بڑے انسان کی نہیں بلکہ سب سے بڑے عمل کی پیدائش ہوئی اور جنگ کے میدانوں میں نہیں بلکہ صبر و استقامت کے میدانوں میں فتح حاصل ہوئی۔ دنیا کی تمام قوموں کا یقین تھا کہ ان کی طاقت و شوکت کی بنیاد اس وقت پڑی جب انہوں نے ملکوں اور سلطنتوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کا یقین یہ تھا کہ طاقت و شوکت کا دروازہ اس دن کھلا جب ملکوں پر اُنہوں نے قبضہ نہیں کیا بلکہ اپنا ملک و وطن بھی ترک کر دیا۔ بلاشبہ ان کی یہ سمجھ دنیا کی ساری قوموں سے اُلٹی تھی، لیکن اس سمجھ سے عین مطابق تھی جو اسلام کی تربیت نے ان کے اندر پیدا

کر دی تھی وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر قوموں کی تقلید سے نہیں بلکہ اسلام کی رُوح فکر و عمل سے کرنی چاہتے تھے -

ہجرت مدینہ کی حقیقت

لیکن واقعۂ ہجرت کیا تھا؟ وہ ایک ہی واقعہ نہ تھا بے شمار اعمال و وقائع کا مجموعہ تھا - ایک لمحے کے لئے اس کی حقیقت پر غور کر لینا چاہیئے -

اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے - ایک عہد، مکہ کی زندگی اور اعمال کا ہے - دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا - پہلا آنحضرت صلعم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے - اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے - اس کی ابتدا غار حرا کے اعتکاف سے ہوتی ہے - اور تکمیل غار ثور کے انزواپر) دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے - اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے - اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر -

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا اصلی دور، دوسرا دور تھا - کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی اور ظاہری طاقت و حشمت کا سر و سامان شروع ہوا - بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی، مکّہ کی فتح عرب کی فتح کا اعلان عام تھی لیکن خود اسلام کی نظروں میں اس کی زندگی کا اصلی دور، دوسرا دور نہیں پہلا تھا - وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں - بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا - لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں؟ بلاشبہ مکہ کی فتح عرب کی فیصلہ کن فتح تھی - لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی راہ کیونکر کھلتی؟ یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس دور کے اعمال سے فتح ہوا تھا - پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور ہو گیا ہو - لیکن اس کی روح پہلے ہی دور میں ڈھونڈنی چاہیئے - [1]

استعداد داخلی وخارجی

وجود اور زندگی کے ہر گوشے کے لئے خدا کا

---

[1] ع "خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے، نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے" اکبرؔ

قانون وجود ایک ہی ہے۔ تم اس کے کتنے ہی مختلف نام رکھدو مگر وہ خود ایک سے زیادہ نہیں اب ایک لمحے کے لئے ٹھہرو اور غور کرو کہ تخلیق و تکمیل وجود کے لئے خدا کا قانون حیات کیا ہے؟

فرد کی طرح جماعت کا بھی وجود ہے۔ عالم صورت کی طرح عالم معنی بھی اپنی ہستی رکھتا ہے۔ لیکن کوئی چیز ہو تخلیق و تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ یکے بعد دیگرے دو مختلف دوروں سے گذرے پہلا دور "استعداد داخلی" کا ہے۔ دوسرا "استعداد خارجی" کا ضروری ہے کہ پہلے اندر کی استعداد وجود میں آئے اور ضروری ہے کہ اندر کی استعداد کی تکمیل کے ساتھ ہی باہر کی استعداد بھی اُس کے اندر پیدا ہو جائے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے مثال کی ضرورت ہے۔ خدا کی رحمت و ربوبیت نے تمام کائنات ہستی کو بخشش کا خزانہ اور فیضان عام کی بارش بنا رکھا ہے۔ زندگی اور وجود کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ہر چیز موجود ہے۔ اور اس کی موجودگی صرف اس لئے ہے۔ تاکہ استعداد کو ڈھونڈ لے صلاحیت کو پالے اور انفعال کو فعل سے اور انجذاب کو جذب سے مالا مال کر دے سورج روز آسمان پر چمکتا ہے۔ ستارے ہمیشہ زمین کی طرف جھانکتے ہیں۔ ہوائیں یکساں گرم جوشی سے چلتی ہیں۔ بادلوں کی رفتار میں کبھی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ سورج کی کرنیں سمندروں کو کھینچنے اور پانی کے ذخیرے جمع کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتیں۔ زمین کی سطح اپنے سارے خزانے لئے ہوئے موجود ہے۔ خاک کے ذرّوں میں سے ہر ذرّہ اپنا خاصہ اور اپنی تاثیر رکھتا ہے۔ موسموں کی تبدیلی اور لیل و نہار کی گردش بھی اپنے مقصد اور حکمت سے باہر نہیں۔ یہ اسی طرح کی تمام ان گنت اور بے حد و حساب چیزیں۔ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (ابراہیم: ۳۴) اور اگر تم خدا کی نعمتیں اور بخشائشیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی تمہارا اندازہ احاطہ نہیں کر سکتا۔

بیج کی مثال دہقان ایک بیج اُٹھاتا ہے۔ اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو اس بیج کے بار آور ہونے کے لئے قدرت الٰہی نے کس طرح اپنا تمام کارخانہ ہستی مہیا کر دیا ہے۔ سورج منتظر ہے

کہ اپنی گرمی اس کے لئے وقف کر دے بادل طیار ہے کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دے زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے وا کر دے لیکن اس تمام کارخانہ بخشش سے وہ جبھی فائدہ اُٹھا سکتا ہے جبکہ خود اس کے اندر کی استعداد صحیح وصالح ہو اگر ایسا نہیں تو پھر یہ تمام کارخانۂ بخشش ونوال اس کے لئے بیکار ہو گیا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھنے پر بھی اسے گرم نہ کر سکے گا۔ بادل اگر اپنا تمام ذخیرہ آب ختم کر ڈالے جب بھی اسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔

پھر ایک صالح بیج جب زمین میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ تو اس کے اندر کی استعداد ظاہر ہوتی ہے اور اندر ہی اندر پکنے اور بڑھنے لگتی ہے۔ اس وقت وہ ایک چھوٹا سا وجود ہوتا ہے۔ جس کے اندر باریک ذرّوں اور ریشوں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی لیکن انہی ذرّوں اور ریشوں کے اندر اس کی آنیوالی ہستی کی ساری بڑائیاں اور عظمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں حتیٰ کہ کہا جا سکتا ہے۔ ایک عظیم اور تناور درخت کی ساری ٹہنیاں اور پتے اور اس کے ہزاروں پھول اور پھل انہیں ذرّوں اور باریک ریشوں کے اندر موجود ہوتے ہیں وہ بتدریج نشوونما پاتا ہے۔ اور یکے بعد دیگرے تخلیق وتسویہ کے مختلف درجوں سے گزرتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ ہو چکتا ہے۔ تو وہ وقت آجاتا ہے۔ جب زمین کی سطح چاک ہوتی ہے اور اس کی پہلی شاخ باہر نکلتی ہے چنانچہ وہ اُبھرتا ہے۔ اور کائنات فطرت کے جس کارخانۂ فیضان سے زمین کے اندر اکتساب فیض کر رہا تھا اب اس سے زمین کی سطح پر بخشش ونوال حاصل کرنے لگتا ہے۔ اس وقت تم دیکھتے ہو کہ عالم نباتات کا یہ جوان نوخاستہ سرو قد کھڑا ہے۔ اور کارخانہ فطرت کے ہر سامان سے زندگی اور قوت کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اب تم اس کی ہستی کا اعتراف کرتے ہو۔ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ باہر کی استعداد اس کے لئے جو کچھ بہم پہنچا رہی ہے یہ دراصل اسی استعداد کا جواب اور نتیجہ ہے جو زمین کے اندر اُس کی داخلی طبیعت نے پیدا کر لی تھی۔

عالم حیوانات کی مثال

عالم حیوانات میں دیکھو تو یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ حیوان اور انسان

کا جو وجود عالم ہستی میں قدم رکھتا ہے - اور بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی منزلیں طے کرتا ہے - دراصل یہ وہی وجود ہے جو پہلے خود اپنی ہستی کے اندر تخلیق و تکمیل کی منزلیں طے کر چکا ہے - اگر اس کی داخلی استعداد کا دور صحت اور قوت کے ساتھ ختم نہ ہوتا تو اس کی خارجی استعداد کا یہ دور وجود ہی میں نہ آتا وہ پہلے شکم مادر میں جنین کا ابتدائی مادہ تھا پھر اندر ہی اندر بڑھنے اور پھیلنے لگا بتدریج تخلیق و تسویہ کی مختلف منزلیں وجود میں آئیں - پہلے چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جنہوں نے ایک جونک کی سی شکل اختیار کر لی پھر یہ جونک بڑھتے بڑھتے گوشت کا ایک لوتھڑا بن گئی - لوتھڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچا بننا شروع ہوا اور ڈھانچے پر گوشت پوست کا غلاف چڑھ گیا - پھر گوشت اور ہڈیوں کا یہ مجموعہ نظم و تناسب کے ایک ایسے سانچے میں ڈھل گیا کہ شکل و ہیئت کی تمام باریکیاں اور خال و خط کی ساری دلآویزیاں مکمل ہو گئیں پھر جب اندر ہی اندر تکمیل و تسویہ کے یہ تمام مراتب طے ہو گئے تو یہ وجود اس قابل ہوا کہ شکم مادر سے باہر قدم نکالے اور تم نے دیکھا کہ خلقت اور ہستی کا ایک زندہ اور مستعد وجود تمہارے سامنے ہے - ثم انشاناہ خلقاً آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین (مومنون: ۱۴) بہرحال دنیا میں ہر چیز کی تخلیق و تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کارخانۂ فیضان فطرت سے اکتساب فیض کی صحیح استعداد پیدا ہو اور اس استعداد کے ظہور کا پہلا محل اندرونی ہے - دوسرا بیرونی جب تک کوئی چیز اپنے اس پہلے دور میں صحیح استعداد پیدا نہیں کرے گی دوسرے دور کی استعداد پیدا نہیں کر سکتی - خارج کے نشوونما کے لئے داخل کا نشوونما بمنزلہ سبب و علت ہے جبتک سبب موجود نہ ہوگا نتائج ظہور میں نہیں آئیں گے -

جماعت کی داخلی استعداد

فرد اور جماعت دونوں کا ایک ہی حال ہے - یہ افراد و اشیا کی مثالیں تھیں انہی کو جماعتوں اور قوموں پر بھی منطبق کرو - اشیاء و افراد کی طرح "جماعت" بھی پیدا ہوا کرتی ہے - اس کی تخلیق نشوونما اور ترقی و تکمیل کے لئے بھی بعینہٖ وہی قوانین ہیں جو اشیاء و افراد کے لئے ہیں - جس طرح فطرت الٰہی کی ربوبیت نے مخلوقات کی زندگی اور نشوونما کے لئے اپنی بخششوں کے بادل زمین پر پھیلا دئے ہیں ہر شئے زندگی دینے والی ہر شئے

پرورش کرنے والی اور ہر شئے وجود و کمال تک لے جانے والی ہے۔ ٹھیک اسی طرح "جماعت" اور "اُمت" کے ظہور و نشو کے لئے بھی ہر طرح کی بخششوں اور ہر طرح کی فیض رسانیوں کا سامان مہیّا کر دیا ہے۔ ربوبیت اس کے ظہور کا انتظار کرتی اور بخششِ فطرت اِس کے قدم اُٹھانے کی راہ تکتی ہے۔ لیکن جس طرح افراد و اشیاء کے لئے فطرت کا تمام سامان فیض صرف اسی حالت میں مفید ہو سکتا ہے جبکہ خود اُن کے اندر صحیح و صالح استعداد موجود ہو اسی طرح "جماعت" کا مولود بھی وقت کے فیضان قومی و مرز بومی ماحول کی بخششوں سے اسی حالت میں فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ جبکہ خود اُس کے اندر اکتساب و انفعال کی صحیح استعداد موجود ہو۔ پھر جس طرح اس استعداد کی تکمیل کا پہلا مرحلہ داخلی ہے۔ دوسرا خارجی اِسی طرح جماعتوں اور قوموں کے مزاجی استعداد کے لئے بھی پہلا مرحلہ داخلی ہے۔ دوسرا خارجی کوئی جماعت کوئی قوم انسان کی کوئی ہیئت اجتماعیہ کشمکش حیات کی کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتی، اگر پہلے ایک تخم اور جنین کی طرح اپنی داخلی استعداد کی منزل طے نہیں کر لیتی اس کی داخلی تخلیق و تکمیل کا بھی ایک معین وقت اور وقت کی معین مقدار ہے اگر ایک جماعت وجود و کمال کا پورا درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تو ناگزیر ہے کہ پہلے داخلی استعداد کی تکمیل کا وقت بسر کرے اس کے بعد خارج کے اعمال و فتوح کا دروازہ خود بخود اس پر کھل جائے گا کیونکہ خارج کی تمام کامرانیاں اس کی داخلی استعداد کی تکمیل کا نتیجہ و ثمرہ ہوتی ہیں۔

داخلی استعداد کا دَور

ظہورِ اسلام کا پہلا دور جو بعثت سے شروع ہو کر ہجرت پر ختم ہوا۔ اور جس کا نقطۂ تکمیل ہجرت کا معاملہ تھا دراصل جماعت کی داخلی استعداد کا دور تھا اور اس لئے ظہورِ اسلام کی تمام فتح مندیوں اور کامرانیوں کا مبدأ یہی دور تھا نہ کہ مدنی زندگی کا دوسرا دور۔ بلاشبہ دُنیا کی ظاہر بین نگاہوں میں یہ مصیبتوں کا دور اور بے چارگیوں اور درماندگیوں کا تسلسل تھا لیکن بباطن امت مسلمہ کی ہر آنے والی فتح مندی اسی کی مصیبتوں اور کلفتوں کے اندر نشو و نما پا رہی تھی یہی مصیبتیں تھیں جو "جماعت" کے ذہن و اخلاق کے لئے تعلیم و تربیت کا مدرسہ اور تزکیہ نفوس و ارواح کی امتحان گاہ تھیں بدر کے فتح مند اسی کے اندر سبق لے رہے تھے۔ فتح مکہ کے کامران اسی کے اندر بن اور

ڈھل رہے تھے اتنا ہی نہیں بلکہ یرموک اور قادسیہ کی پیدائش بھی اسی کی آزمائشوں اور خود فروشیوں میں ہو رہی تھی یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس جہاد کو تو صرف جہاد کہا جو مدنی زندگی میں اسلحہ جنگ سے کرنا پڑا تھا۔ لیکن نفس و اخلاق کے تزکیہ و تربیت کا جو جہاد اس سے پہلے دور میں ہو رہا تھا اُسے "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا۔ کیونکہ فی الحقیقت بڑا جہاد یہی جہاد تھا فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادًا کبیرًا (الفرقان ۵۳) بالاتفاق سورہ فرقان مکی ہے۔ مکی زندگی میں جس بڑے جہاد کا حکم دیا گیا تھا ظاہر ہے کہ وہ قتال کا جہاد نہ تھا صبر و استقامت اور عزم و ثبات کا جہاد تھا اور انہی اوصاف میں جماعت کی داخلی استعداد کی اصلی بنیادیں تھیں۔

تکمیل کار کا اعلان

ہجرت کا واقعہ اس دور کی مصیبتوں کی انتہا تھی اس لئے اس کی برکتوں اور سعادتوں کی بھی آخری تکمیل تھی۔ صحابہ کرامؓ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے اور کیونکر بے خبر ہو سکتے تھے۔ جبکہ اُن کی دماغی تربیت کی اصلی روح اسی معاملہ میں مضمر تھی؟ پس جب یہ سوال سامنے آیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا کس واقعے سے کی جائے تو اُنہیں کسی ایسے واقعہ کی جستجو ہوئی جو اُمت کے قیام و اقبال کا اصلی سرچشمہ ہو۔ آنحضرت صلعم کی پیدائش کا واقعہ یقیناً سب سے بڑا واقعہ تھا۔ لیکن اس کے تذکار میں شخصیت سامنے آتی تھی شخصیت کا عمل سامنے نہیں آتا تھا۔ بعثت کا واقعہ بھی سب سے بڑا واقعہ تھا لیکن وہ معاملہ کی ابتدا تھی انتہا و تکمیل نہ تھی بدر کی جنگ اور مکہ کی فتح عظیم واقعات تھے لیکن وہ اسلام کی فتح و بنیاد نہ تھے کسی دوسری بنیاد کے نتائج و ثمرات تھے۔ یہ تمام واقعات ان کے سامنے آئے لیکن ان میں سے کسی پر بھی طبیعتیں مطمئن نہ ہو سکیں۔

بالآخر جب ہجرت کا واقعہ سامنے آگیا تو سب کے دلوں نے قبول کر لیا کیونکہ انہیں یاد آگیا۔ اسلام کے ظہور و عروج کا مبدائے حقیقی اسی واقعہ میں پوشیدہ ہے اور اس لئے یہی واقعہ ہے جسے اسلامی تاریخ کا مبداء بننا چاہیئے۔

مدینہ کی فتح

پھر یہ حقیقت کسی درجہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ظہور اسلام کی تمام فتح مندیوں میں سب سے پہلی فتح مدینہ کی فتح تھی اور اس کی تکمیل ہجرت ہی کے واقعہ سے ہوئی تھی۔

مدینہ کے ساتھ" فتح " کا لفظ سن کر تعجب ہوا ہوگا۔ کیونکہ تم صرف اسی فتح کے شناسا ہو جو جنگ کے میدانوں میں حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ میدان جنگ کی فتح سے بھی بڑھ کر دلوں کی آبادیوں اور رُوحوں کی اقلیموں کی فتح ہے[1] اور اسی فتح سے میدان جنگ کی فتح مندیاں بھی حاصل ہوتی ہیں عین اس وقت جبکہ اسلام کا داعی اپنے وطن اور اہل وطن کی شقاوتوں سے مایوس ہوگیا تھا باشندگان یثرب کی ایک جماعت پہنچتی ہے اور رات کی تاریکی میں پوشیدہ ہوکر اپنی روح کا ایمان اور دل کی اطاعت پیش کرتی ہے اس وقت دنیوی جاہ وجلال کا نام ونشان نہیں ہوتا سیف وسنان کی ہیبت وجبروت کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا سرتاسر غربت اولی کی بے سروسامانیاں اور عہد مصائب ومحن کی درماندگیاں ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ یثرب کی پوری آبادی اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور ایمان کے ایسے جوش اور عشق واطاعت کی ایسی خود فروشیوں کے ساتھ اس کے استقبال کیلئے طیار ہوجاتی ہے جو تاریخ عالم کے کسی بڑے سے بڑے فاتح اور شہنشاہ کو بھی میسر نہ آئی ہوگی دلوں اور رُوحوں کی اس فتح وتسخیر سے بڑھکر بھی کوئی اور فتح ہو سکتی تھی؟ لیکن یہ فتح کیونکر ہوئی؟ دور ہجرت کے آلام ومحن میں اس کا آغاز ہوا اور ہجرت نے اس فتح کی تکمیل کر دی۔

واقعۂ ہجرت اور فتح ونصرت الٰہی

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے واقعہ ہجرت کا ذکر اس طریقہ پر کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ بے سروسامانی وغربت کے اس عمل ہی میں فتح ونصرت الٰہی کی سب سے بڑی معنویت پوشیدہ تھی۔

ثانی اثنین اذ ھما فی الغار	غار کے دو ساتھیوں میں جب ایک
اذ یقول لصاحبہ لاتحزن	نے دوسرے سے کہا غم ورنج نہ
ان اللہ معنا فانزل اللہ	کرو یقیناً خدا ہمارے ساتھ ہے
سکینتہ علیہ وایدہ	اور اس کی مشیت وحکمت ہمارے
بجنود لم تروھا وجعل	لئے فتح ونصرت کی راہ باز کرنے والی
کلمۃ الذین کفروا	ہے پھر ایسا ہوا کہ خدا نے اپنی تسکین

[1] ع" جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ! "

(بقیہ صف۴۴ پر ملاحظہ کریں)

قرآن فہمی کے بنیادی اصول

(مولانا عبدالغفار حسن صاحب مدظلہ)

(یہ تقریر ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء بروز جمعہ رابطۃ العلوم الاسلامیہ کراچی کے ہال میں کی گئی)

الٓرٰ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۙ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَوَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ۙ الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ ۝

یہ چند آیات سورۃ ابراہیم کے پہلے رکوع کی ہیں۔ فرمایا۔ الرا۔ یہ سورت الف۔ لام۔ را ہے اور اس کا دوسرا نام سورت ابراہیم ہے۔ کتابٌ یعنی ھٰذا کتابٌ۔ یہ کتاب ہے۔ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ۔ ہم نے اسے آپؐ کی طرف اتارا ہے۔ لِتُخْرِجَ النَّاسَ تاکہ آپؐ لوگوں کو نکالیں۔ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ تاریکیوں سے روشنی کی طرف۔ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ۔ اپنے رب کے اذن سے۔ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ۔ وہ نور کیا ہے؟ عزیز وحمید کا راستہ۔ اور وہ عزیز وحمید کون ہے؟ اللّٰهِ الَّذِیْ وہ اللہ جس کے لئے ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے۔ وَوَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ۔ اور ویل ہے خرابی ہے کافروں کے لئے سخت عذاب کی۔ اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ۔ وہ لوگ جو آخرت کے مقابلے میں دنیا کو پسند رکھتے ہیں۔ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا۔ اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ۔ یہی لوگ گہری گمراہی میں ہیں۔

آج کل ہمارے ملک میں چونکہ اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کے

اجزاء کا چرچا ہے اس لئے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اسلامی قوانین یا اسلامی شریعت کا اصل سرچشمہ کیا ہے۔ اصل سرچشمہ اور اصل بنیاد قرآن مجید ہے۔ اس وقت سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ خواہ عوام ہوں، خواہ حکمران ہوں۔ اُن کو سب سے پہلے قرآن مجید سے تعلق رکھنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے قرآن مجید کے بارے میں بتایا جائے کہ اس کا فہم کیسے حاصل ہوتا ہے۔ ہم قرآن مجید کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ وہ کون سے وسائل اور کون سے ذرائع ہیں۔ جن کے ذریعہ سے ہم قرآن مجید کو صحیح معنی میں سمجھ سکیں اور جو اس کا مقصد نزول ہے وہ حاصل ہو۔ درس قرآن مجید جس کا اخبارات میں اعلان کیا گیا تھا، اُس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ کوئی سورت لے لی جائے اور اس سورت یا اس کی چند آیات کی تشریح کی جائے۔ اور دوسری شکل درس قرآن کی یہ ہے کہ ایک عنوان چُن لیا جائے اور اس عنوان کے تحت جتنی آیتیں ہیں۔ اور کتاب و سُنّت سے جو معلومات حاصل ہیں اُن کو یکجا کر کے پیش کر دیا جائے۔ آج درس قرآن کے سلسلہ میں دوسرا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے یعنی قرآن مجید کے عنوان سے آج درس ہوگا اور اس سلسلہ کی آیات اور سُنّت کی معلومات کو پیش کیا جائے۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ اور زبان سے وہی نکلے جو سچ ہو اور حق ہو اور خود کہنے والے کو بھی اور سُننے والوں کو بھی عمل کی توفیق حاصل ہو۔

یہ آیت جو تلاوت کی گئی ہے اس میں مقصدِ نزول قرآن بیان کیا گیا ہے۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ لیکن نہایت ہی سادہ الفاظ میں فرمایا۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ اے محمدؐ ہم نے کتاب آپؐ کی طرف اس لئے اتاری ہے تاکہ آپؐ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالیں۔ یہ مقصد ہے اس کتاب کے نزول کا۔ تاریکیاں بہت سی پھیلی ہوئی ہیں۔ اور جس وقت قرآن مجید نازل ہوا تھا اس وقت بہت سی تاریکیاں اور اندھیرے تھے۔ کفر و شرک کے اندھیرے۔ رسم و رواج کے اندھیرے، شخصیت پرستی بُت پرستی اور زر پرستی کے اندھیرے۔ نہ معلوم کتنی تاریکیاں تھیں قبائل پرستی اور زبان پرستی۔ ان تمام تاریکیوں کو چھانٹنے اور نور کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے قرآن مجید کا نزول ہوا۔ اور یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ وہاں ظلمات کو جمع لایا گیا ہے۔ ظلمات جمع ہے ظُلمت کی۔ اور

اس کے مقابلہ میں حق کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہاں صرف نُور کہا۔ نُور کی جمع انوار نہیں کہا۔ ظُلمات جمع ہے اور نور واحد ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گمراہیاں اور تاریکیاں بہت سی ہیں ان کے راستے بھی بہت سے ہیں۔ لیکن نُور ایک ہی ہے۔ حق ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہی ہے۔ یعنی قرآن مجید۔ یہ توحید کو سمجھانے کیلئے بیان کیا گیا ہے۔ انبیاء کرامؑ اور رسُول اکرمؐ کا یہ مقصد تھا کہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ۔ یہ اُن کے رب کے اذن سے ہے۔ انہیں اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے۔ اس بنا پر اس دعوت کو رسُول اکرمؐ نے قبول فرمایا۔ اور پھر اس کو پیش کیا۔ اور وہ نور کیا ہے؟ صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ کہ جو عزیز ہے۔ غالب ہے جس پر کوئی دوسرا غالب نہیں آسکتا اور جو حمید ہے حمد والا ہے جو اپنی رحمتوں اور اپنی نعمتوں اور انعام واکرام کی بنا پر حمد کا مستحق ہے، حمد والا ہے۔ اس کے راستہ کی طرف۔ اور جس کی حکمرانی تمام کائنات پر ہے اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُس کے قبضہ میں ہے۔ اُسی کے تابع ہے۔ اُس کے بعد بتایا کہ پھر رکاوٹ کیا ہے۔ روشنی سامنے آجائے تو لوگ اُس کو کیوں نہیں مانتے۔ اس کی وجہ کیا ہے تو فرمایا۔ وَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ۔ جب کفر دلوں میں راسخ ہو جاتا ہے اور انسان معاندانہ روش اختیار کر لیتا ہے تو پھر قبول حق کے دروازے اُس کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور یہ کفر انسانوں کے دلوں پر ڈیرے کس طرح ڈالتا ہے اس کی بڑی وجہ ہے اَلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ۔ کہ لوگ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب دُنیا کو آخرت پر ترجیح دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب حق اُن کے مفاد پر چوٹ لگائے گا اور اُن کے فائدوں پر زد پڑے گی تو ظاہر بات ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ دعوتِ حق اور دعوتِ قرآن قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ لوگ دنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسے آخرت کے مقابلہ میں پسند رکھتے ہیں اور اسی بناء پر وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ صرف خود نہیں رُکتے بلکہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس دعوتِ حق کو، قرآن مجید کی دعوت کو بدنام کرنے کے لئے اُن کا ایک رویہ یہ بھی ہے۔ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا۔ کہ اس میں کجی تلاش کرتے ہیں، کجی ہے نہیں بلکہ تلاش کرتے ہیں

کوشش کرتے ہیں کہ کوئی چیز ایسی مل جائے جس سے لوگ مغالطہ میں پڑ جائیں اور قرآن مجید کی دعوت سے لوگ مستفید نہ ہو سکیں۔ فرمایا:۔ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۔ یہی لوگ گہری گمراہی میں ہیں۔ یہاں تک تفسیر ہے اُن آیات کی جن میں قرآن مجید کا مقصدِ نزول بیان کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کا مقصد نزول کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے خود قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے قرآن مجید پر انسان ایمان لائے، اس کی عظمت کا قائل ہو اور اس کو بڑے اطمینان کے ساتھ پڑھے جیسا کہ فرمایا: وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا اور قرآن مجید کو ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھیئے۔ یا سورۃ اسراء میں فرمایا:۔ وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ۝

کہ ہم نے اس قرآن مجید کو اتارا ہے تاکہ آپ اسے ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھیں۔ تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکلنے کے لئے پہلا زینہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو بڑے اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھا جائے اُس کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ یہ کلام الٰہی ہے اور اس سے ہم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

دوسرا زینہ یہ ہے کہ محض قرآن مجید کا پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں رواج ہے یا بلادِ عجم میں اور جگہ بھی یہ رواج ہے بلکہ عربوں میں بھی یہ مصیبت آگئی ہے کہ قرآن مجید پڑھتے ہیں سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو عرب ہو، عربی جانتا ہو، وہ قرآن مجید سمجھ ہی جائے بلاتشبیہ عرض ہے کہ جس طرح بہت سے لوگ بانگ درا یا غالب کا دیوان پڑھے ہوئے ہیں یہ اُردو میں ہیں، لیکن ہر ایک اُردو دان اس کو نہیں سمجھتا۔ سمجھنے کیلئے تو کاوش کی ضرورت ہے۔ عربوں کے اندر بھی اب یہ رواج ہے کہ وہ بس تبرّکاً پڑھ لیتے ہیں۔ یہ تبرک کا ایک فلسفہ ہے۔ یا نظریہ کہئے خیال کہئے اس نے بھی ہمیں قرآن مجید سے بہت دُور ڈال دیا ہے اور میں یہ کوشش کروں گا کہ درس کے آخر میں "موانعِ فہم قرآن" کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں۔ اس موقع پر تفصیل سے بتاؤں گا کہ کون کون سی رکاوٹیں ہیں جنہوں نے ہمیں قرآن مجید سے دُور کر دیا ہے۔ جب تک کہ رکاوٹیں نہیں ہٹیں گی اُس وقت تک ہم قرآن مجید سے قریب نہیں ہو سکتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا زینہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھا جائے جیسا کہ فرمایا:۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (سورۃ ص آیت ۲۹) کہ ہم نے برکت والی کتاب اُتاری ہے تاکہ اس کی آیات میں تدبّر کر لیا جائے جو عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں، یعنی تبرّک کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی اس کو محض چُوم لے اور چاٹ لے جیسا کہ آج کل لوگ کرتے ہیں۔ یہ چُوما چاٹی ہی تبرّک کی نشانی ہے اور اس سے گویا کہ ان کے خیال میں قرآن مجید کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کو جب آپ نے سمجھ لیا تو پھر تیسرا زینہ عمل بالقرآن ہے کہ قرآن مجید پر عمل کیا جائے۔ جیسا کہ فرمایا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ۔ یعنی ہم نے اس کتاب کو اتارا ہے تاکہ آپ اُن کے درمیان فیصلے کریں۔ اُن کے جھگڑوں کو چُکائیں کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن مجید کے احکام کو جاری کریں۔ اور قرآن مجید نے جن چیزوں کو حلال ٹھیرایا ہے ان کو حلال سمجھیں اور جن چیزوں کو حرام ٹھیرایا ہے انہیں حرام سمجھیں۔ محض سمجھنا ہی کافی نہیں ہے۔ آج کل بہت سے مستشرقین ہیں۔ جنہوں نے قرآن مجید کی بظاہر بڑی خدمت کی ہے۔ بہت سے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ صرف تحقیق برائے تحقیق ہے۔ اُن کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اس پر عمل کریں گے یا وہ سارے کے سارے قرآن مجید کی عظمت کے قائل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض قائل ہوں لیکن ایمان نہیں لائیں گے۔ اُن کا مقصد محض تحقیق کرنا ہے۔ جس طرح علوم شرقیہ کی دوسری کتابوں کی تحقیق کر رہے ہیں اُسی طرح قرآن مجید کی بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دل و جان سے قرآن مجید کی خدمت کر رہے ہیں۔ تیسرا زینہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھ کر اُس پر عمل کیا جائے۔ اپنے اُوپر، اپنے گھر والوں پر اپنی برادری پر، اپنے کُنبہ پر اور اگر اللہ تعالےٰ اختیارات دے تو پورے ملک پر۔ یعنی جس قدر بھی ممکن ہو سکے قرآن مجید کی تعلیم کو پھیلایا جائے اور نافذ کیا جائے۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ آپ جب اس کو اپنے اوپر اپنے گھر والوں پر جاری و نافذ کرتے ہیں تو یہ نعمت آپ کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ اس کو پھیلایا جائے۔ فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔ (سورۃ النحل۔ آیت ۴۴) کہ جو ہم نے ذکر نازل کیا ہے اس کو آپ پھیلائیے۔ جب تک کہ یہ سارے سلسلے اور سارے زینے ہم نہ اپنائیں گے

اُس وقت تک تاریکیوں سے نُور کی طرف نہیں آ سکتے۔ اگر قرآن مجید کو صرف تبرّک بنا کر رکھ لیں تو اس سے فہم حاصل نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید کو کس طرح سمجھا جائے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خود قرآن مجید ہی سے اس کو سمجھا جائے۔ القرآن یفسر بعضہ بعضاً قرآن کا کچھ حصہ کچھ حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اگر ایک جگہ پر اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی تفسیر ہے اگر ایک جگہ آپ سمجھتے ہیں کہ بات ذہن میں واضح نہیں ہو رہی ہے تو قرآن مجید میں اُسے دوسری جگہ کھول دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ دکھا ہم کو سیدھا راہ۔ راہ اُن کی جن پر تُونے انعام کیا۔ اب یہ کون لوگ ہیں جن پر انعام کیا ہے۔ سُورۃ بقرہ میں مغضوب علیہم کا بیان آیا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں ضالین کا۔ اور اس کے بعد سُورۃ نساء میں جا کر کھولا ہے کہ انعمت علیہم سے کون لوگ مُراد ہیں فرمایا۔ أُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝ (سُورۃ نساء۔ آیت ۶۹) یعنی انبیاءِ کرامؑ کی جماعت، صدّیقین کی جماعت، شہداء کی جماعت جنہوں نے اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کیں اور اس طرح اپنے ایمان کی شہادت دی۔ اور صالحین۔ اللہ کے نیک بندے جو حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں اور اللہ کے دین کو قائم رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر ہو گئی اُس اجمال کی جو سورت فاتحہ میں ہے۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں مغضوب علیہم کے ضمن میں یہود کا ذکر آتا ہے اور سُورت آل عمران میں نصاریٰ کا ذکر آتا ہے۔ یہ ضالین ہیں۔ مغضوب علیہم اور ضالین میں فرق ہے۔ مغضوب علیہم وہ قوم ہے جو معاندانہ روش اختیار کرتی ہے۔ جانتے بوجھتے حق سے کتراتی ہے۔ علم رکھتے ہوئے حق کو جُھٹلاتی ہے۔ یہود اس میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ حق کیا ہے۔ یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم — وہ رسُول اکرمؐ کو پہچانتے تھے۔ جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے اور کوئی شک نہیں کرتے تھے کہ یہ ہماری اولاد ہے۔ اُسی طرح رسُول اکرمؐ کو پہچانتے تھے کہ یہ اللہ کے رسُول ہیں۔ اس معرفت اور علم کے باوجود انکار کیا۔ یہ یہود تھے جنہوں نے عناد اور سرکشی

کی راہ اختیار کی۔ ضالین وہ ہیں جو بغیر علم کے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ علم ہی حاصل نہیں کیا۔ نصاریٰ میں یہ وصف نمایاں ہیں۔ ان میں معاندین بھی ہوں گے لیکن زیادہ وہ ہیں جنہوں نے علم کے بغیر گمراہی کی راہ اختیار کی۔ اسی لئے نصاریٰ میں بدعات زیادہ پیدا ہوئیں۔ بدعات زیادہ وہاں پیدا ہوتی ہیں جہاں سرکشی اور عناد ہے وہاں بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ بغاوت اور بدعت میں فرق ہے۔ بغاوت کے معنی ہیں دین سے نفرت اور بدعت وہ ہے جہاں بدعتی دین سے محبت رکھتا ہے۔ اتنی زیادہ محبت رکھتا ہے کہ پھر وہ دین کے معاملہ میں غلو کر جاتا ہے۔ اور اپنی طرف سے کچھ ایسے طریقے ایجاد کرتا ہے جن سے وہ چاہتا ہے کہ وہ اور آگے بڑھ جائے۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا:- وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ کہ رہبانیت یعنی ترک دنیا کا طریقہ نصاریٰ نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے خود اس کو ایجاد کیا ہے۔ یہ بدعت ان کی طرف سے ہے۔ ہم نے یہ طریقہ ان پر لازم نہیں کیا تھا۔ ہم نے یہ طریقہ اُن کو نہیں سکھایا تھا۔ یہ اُن کی اپنی ایجاد ہے۔ تو یہ فرق ہے۔ مغضوب علیہم اور ضالین میں۔ اور ان دونوں کی تفسیر سورۃ بقرہ اور سورۃ آلِ عمران میں آگئی۔ اسی طرح قرآن مجید میں آتا ہے۔ ایک اور مثال لیجئے۔ فرمایا:- وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝ (سُورَةُ الحِجر آیت ۹۹)۔ اور اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین آجائے۔ اب یہاں پر لوگوں کو مغالطہ ہوگیا کہ یقین اپنے مشہور مفہوم میں مستعمل ہے۔ اب جب یقین آگیا تو نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے۔ معلوم ہوا کہ ناظم آباد میں کوئی پیر صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے مرید سے کہا کہ عبادت ہم نے کرلی اور عبادت کرکے اب ایسے مقام پر ہم پہنچ گئے ہیں کہ اُس کے بعد اب نماز روزہ کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص فوج کا سالارِ اعلیٰ بن جائے تو وہ تو پریڈ نہیں کرتا۔ پریڈ تو نیچے کے لوگ کرتے ہیں۔ پریڈ تو سپاہی کرتے ہیں۔ سالارِ اعظم یا کمانڈر انچیف تو پریڈ نہیں کرتا۔ وہ اس سے بالاتر ہوگیا۔ اسی طرح جب یقین آگیا ہے تو عبادت کے تم مکلف نہیں رہے ہو۔ یہ کتنا گمراہ کن عقیدہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسی زندگی میں غیر مکلف ہوگیا۔ اور عبادت کی زحمت سے اپنے آپ کو بچالیا کیونکہ اسے وہ زحمت سمجھتا ہے حالانکہ رسول اکرم ﷺ

کا یہ حال تھا کہ آپ عبادت کرتے تھے (حتیٰ تو رمت قدماہ) - یہاں تک کہ آپؐ کے قدم مبارک پر ورم آجاتا تھا - رات کو تہجد کی عبادت دیر دیر تک کرتے تھے - لمبے لمبے قیام کرتے تھے - حضرت عائشہؓ نے ایک بار کہا - آپؐ کا اتنا بڑا درجہ ہے - آپؐ بخشے بخشائے ہیں - آپؐ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں - آپؐ اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں تو فرمایا - [فلا اکون عبدًا شکورًا] کیا میں اللہ تعالیٰ کا عبدِ شکور نہ ہوں مجھ پر اتنے انعامات اور احسانات اللہ تعالیٰ نے کئے ہیں - کیا میں ان کا شکریہ ادا نہ کروں - معلوم ہوتا ہے کہ جو جتنا اونچا ہوتا ہے - مراتب کے لحاظ سے، وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جاتا ہے اتنا ہی عبادت میں اُس کا ذوق بڑھ جاتا ہے - اور جتنا وہ اللہ تعالیٰ سے دُور ہوتا ہے - اُسی قدر شیطان کے پھندے میں پھنس کر اللہ تعالیٰ کی عبادت سے محروم ہو جاتا ہے - قرآن مجید میں یقین کے معنیٰ ایک اور بھی آئے ہیں - سورۃ مدثر میں آتا ہے کہ جب جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے اور جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو جنتی جہنمیوں سے سوال کریں گے - مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ - تمہیں جہنم میں کس چیز نے دھکیل دیا - تم نے کیا کرتوت کئے تھے کہ جن کی بنا پر تم جہنم میں گئے - قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۝ (سورۃ مدثر - آیات ۴۲ تا ۴۷) انہوں نے کہا کہ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے - نمازیوں میں ہمارا شمار نہیں تھا کیونکہ نماز ادا نہیں کرتے تھے - اور غریبوں مسکینوں کو ہم کھانا بھی نہیں کھلاتے تھے اُن کی مدد بھی نہیں کرتے تھے اور گپ شپ کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغول ہو جاتے تھے - اور ہم الدین یعنی یوم جزاء کے منکر تھے - اور یہ سلسلہ ہمارا جاری رہا حتیٰ اتنا الیقین - یہاں تک کہ ہمیں یقین آگیا - یہاں یقین کے معنی موت کے ہیں - یعنی آخری سانس تک ہمارا یہی عمل رہا - یہاں یقین کے جو مشہور معنی ہیں وہ آپ نہیں لے سکتے - قرآن مجید کی اصطلاح میں یقین کے معنیٰ موت کے بھی آتے ہیں کیونکہ موت سے زیادہ یقینی چیز اور کوئی نہیں - بہت بڑا وصف موت کا یقین ہے - ہم روزانہ دیکھتے ہیں - آج اس کو کاندھا دے رہے ہیں، آج اس کے ہاں تعزیت کے لئے جا رہے ہیں - آج وہاں سے خبر آئی ہے کہ فلاں کا انتقال ہو گیا ہے - آخر یہ کیا ہے؟ کوئی کتنا ہی عقل کا اندھا ہو، بے شعور ہو لیکن یہ چیز ایسی ہے کہ

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ اس کے معنی ہوتے کہ اپنے رب کی عبادت کر آخری سانس تک یہاں تک کہ تجھے موت آجائے۔ تو قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر دوسری جگہ آئی۔ یا ایک جگہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ یعنی تمہیں تکاثر نے غافل کر دیا۔ یعنی کثرت میں مقابلہ آرائی نے۔ اب یہ تکاثر کیا ہے؟ کس چیز میں تکاثر؟ قرآن مجید نے اس بات کو یہاں نہیں چھیڑا ہے۔ سورۃ حدید میں فرمایا:۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۔ (آیت ۲۰)

وہاں اس کو کھول دیا کہ تکاثر زیادہ تر مال میں اور اولاد میں ہوتا ہے۔ مقابلہ آرائی اور فخر اس چیز میں ہوتا ہے کہ ہمارا جتھا بڑا ہے۔ ہمارے پاس غنڈے، بدمعاش اور لڑنے والے زیادہ ہیں جیسا کہ سورۃ کہف میں فرمایا:۔

فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝ (آیت ۳۴) سورۃ کہف میں ایک کافر اور ایک مومن کا مکالمہ درج کیا ہے۔ وہاں کافر کہتا ہے کہ میں تجھ سے مال میں زیادہ ہوں اور میری جمعیت اور میرا جتھا بڑا قومی ہے۔ اس طرح قرآن مجید میں ایک جگہ اجمال ہے اور اس کی تفسیر دوسری جگہ ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا وقت نہیں صرف چند اشارات کر دیتے ہیں۔ جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی نہیں کہ آپ کہیں سے کوئی ایک آیت لے لیں اور یہ سمجھیں کہ بس ہم نے قرآن مجید کو سمجھ لیا ہے بلکہ قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے پورے قرآن مجید پر نگاہ ڈال جاتی ہے اور ایک آیت کی تفسیر دوسری جگہ مل جاتی ہے۔

فہم قرآن کا دوسرا ذریعہ ۷

قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے دوسرا ذریعہ اس کا سیاق و سباق ہے۔ قرآن مجید کے آگے پیچھے کی عبارت اور آیات سے بھی مطلب حل ہو جاتا ہے۔ اگر بیچ میں سے آپ نے کوئی ایک آیت لے لی اور نہ سیاق دیکھا نہ سباق۔ سباق کے معنی ہیں کہ پہلی آیات میں کیا ہے اور سیاق کے معنی کہ بعد کی آیات میں کیا ہے۔ سیاق و سباق سے بے پرواہ ہو کر اگر آپ قرآن مجید میں غور کرتے ہیں تو اس سے قرآن مجید کا اصل مفہوم

آپ کو نہیں مل سکے گا اور فہم قرآن میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے بلکہ مغالطہ ہوسکتا ہے ۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ آتا ہے :۔ اَوَ لَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ (سورۃ عنکبوت آیت ۵۱) فرمایا ۔ کیا اُن کو کافی نہیں ہے کہ ہم نے اُن پر کتاب اتاری ہے جس میں رحمت ہے اور نصیحت ہے مومنوں کے لیئے ۔ اب اس آیت کو ان لوگوں نے مغالطہ دینے کے لئے ۔ چن لیا ہے جو حدیث کو حجت نہیں سمجھتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے اس آیت کی رُو سے قرآن کافی ہے ۔ حدیث اور سُنّت کی کیا ضرورت ہے ۔ اِن مغالطوں کی باقاعدہ کتابوں اور رسالوں میں اشاعت ہورہی ہے اور اُن نوجوانوں کو جو قرآن مجید کو نہیں سمجھتے یا اُن کا قرآن مجید سے تعلق نہیں رہا ہے ، مغالطہ میں مبتلا کیا جارہا ہے ۔ اور اُن کے ذہن میں یہ بٹھانے کی کوشش ہورہی ہے کہ حدیث وسُنّت کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ، قرآن خود کہہ رہا ہے کہ ہمارے لئے بس قرآن کافی ہے ۔ لیکن آپ اگر یہ دیکھیں کہ اس کا سیاق وسباق کیا ہے ۔ اس سے پہلے کیا ہے ۔ کس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے ؟ اس سے پہلے یہ آتا ہے ۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ اس نبی پر رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوتیں ۔ اُن کا مطالبہ معجزوں کے لئے تھا جس طرح حضرت موسیٰؑ کو معجزہ دیا گیا تھا کہ سمندر پھٹ گیا اور قافلہ گذر گیا ۔ حضرت عیسیٰؑ کو معجزات دیئے گئے تھے جنہیں لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کس طرح کوڑھیوں کو اچھا کرتے ہیں اندھوں کو بینا بناتے ہیں ۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس طرح کے معجزات اور اس طرح کی نشانیاں رسُول اکرمؐ کو کیوں نہیں دی گئیں ۔ یہ تھا اُن کا سوال اُن آیات کو پھر پڑھیئے :۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ○ اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ (سورۃ عنکبوت ۔ آیات ۵۰ و ۵۱) فرمایا ۔ یہ معجزے اور نشانیاں طلب کرتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو دیئے گئے ۔ تو کیا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اُن کے لئے کافی نہیں ہے جو اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہے اور جو رحمت بھی

ہے اور نصیحت بھی۔ یہ زندہ معجزہ ہے قیامت تک کیلئے معجزہ ہے۔ آخر اس معجزہ کے ہوتے ہوئے پھر وہ کہتے ہیں کہ ایسے معجزے دکھاؤ جیسے کہ دوسرے انبیاء کرامؑ نے دکھائے۔ یہاں وہ بات بنتی نہیں ہے جو منکرین حدیث بنانا چاہتے ہیں۔ یہاں نہ حدیث کے ردّ کا سوال ہے نہ اس کے عدم حجیت کا معاملہ ہے۔ یہاں جو اُن کا اصلی سوال اور مقصد تھا کہ محسوس معجزات دکھاؤ، اُس کو ردّ کیا گیا ہے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کا سیاق و سباق بھی ہمارے سامنے رہے۔ لیکن اگر وہ سامنے نہیں رہتا تو ایسی صورت میں یہ عین ممکن ہے کہ ہم غلط راستے پر چلے جائیں۔ اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی مثالیں ہو سکتی ہیں لیکن اس وقت میں ایک ہی مثال پر اکتفا کروں گا۔

قرآن فہمی کا تیسرا ذریعہ

قرآن فہمی کے لئے تیسرا ذریعہ تعاملِ اُمّت ہے۔ یعنی پوری اُمّت کا جو تعامل چلا آ رہا ہے وہ بھی قرآن مجید کے فہم میں معاون ہے۔ اگر تعامل امّت کو آپ نظر انداز کر دیں تو پھر ایسی صورت میں قرآن مجید کا فہم حاصل نہیں ہو سکتا تعامل سے مراد ہے عہدِ نبویؐ سے لیکر صحابہؓ کے دَور میں، تابعین کے دَور میں، محدّثین اور فقہاء کے دَور میں مفسّرین کے دَور سے لے کر اب تک جو بات لوگوں میں دِین کے نام سے رائج چلی آ رہی ہے وہ قرآن کے لئے بہترین تفسیر ہے۔ یہ نہیں کہ ساتویں صدی ہجری سے لے کر اب تک جو رسم و رواج اور بدعات رائج ہو گئیں۔ اُن کو ہم تعاملِ امّت کہہ دیں۔ وہ تعاملِ اُمّت نہیں کہلائی جا سکتیں۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ نماز قائم کرو۔ اب یہ نماز کس طرح قائم کریں۔ کتنی رکعات ظہر کی ہیں کتنی عصر کی ہیں۔ یہ تعامل ہے۔ یہ تواتر ہے اس کا انکار ایسے ہی ہے جیسے قرآن مجید کا انکار جس طرح قرآن مجید تواتر سے ثابت ہے اُسی طرح نماز کی رکعات بھی۔ ایک مرتبہ میں یہی مضمون بیان کر رہا تھا تو میری زبان سے غلطی سے عصر کی تین رکعتیں نکل گئیں۔ فوراً آوازیں آئیں چار رکعتیں۔ چار رکعتیں۔ میں نے کہا کہ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ یہ کتنا مشہور مسئلہ ہے۔ اذان میں کوئی شخص کوئی لفظ بڑھاتا ہے کم کرتا ہے تو وہ معلوم ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے اذان کے آگے پیچھے کچھ بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ یہ تعاملِ اُمّت

کے خلاف ہے۔ صلوٰۃ وسلام اپنی جگہ ہے۔ آپ اسے پڑھنا چاہیں پڑھیئے۔ لیکن اذان سے قبل یا اذان کے بعد بلند آواز سے تو نہیں پڑھنا چاہیئے۔ پنجاب کے ایک شہر کا ایک قصہ ہے۔ وہاں ایک بابے نے بچی سے پوچھا۔ اذان سناؤ۔ اُس نے کہا۔ السلام علیک یارسُول اللہ، السلام علیک یارسُول اللہ۔ چونکہ وہ روز اذان سے قبل یہ سنتی تھی، اُس نے اسی کو نقل کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ اس طرح ہم آہستہ آہستہ سُنّت سے بیگانہ ہو کر بدعات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اذان، نماز کی رکعات کی تعداد تعامل اُمّت سے ثابت ہیں۔ پانچ کا لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا ہے لیکن اُمّت کا پورا تعامل ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہے۔ ہاں منکرین حدیث میں سے بعض نے کہا تین وقت، کسی نے کہا دو وقت، کسی نے کہا ایک وقت، کسی نے کچھ اور بھی کہا ہے، یہ الگ مضمون ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تعامل کا جو انکار کرتا ہے وہ قرآن مجید کا منکر ہے۔ تعامل حدیث کی کتابوں میں موجود ہے اُمت کے تعامل سے احادیث کے مضمون کی تائید ہو جاتی ہے اس طرح دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کے فہم کا یہ تیسرا ذریعہ ہے ورنہ آپ جمع کیسے کریں گے؟ حج نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے کیا ہے جزیات میں اختلاف ہے۔ لیکن جو بنیادی اور اہم چیزیں ہیں مثلاً طواف سعی احرام اُن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

فہم قرآن کا چوتھا ذریعہ

اس کے بعد فہم قرآن کا چوتھا ذریعہ ہے اخبار آحاد۔ یعنی وہ احادیث جن کا درجہ تواتر کا نہیں ہے لیکن وہ صحیح روایات ہیں۔ ثقہ راویوں سے وہ روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان روایات کی بنیاد پر ہم یہ کہیں گے کہ اگر قرآن مجید کی کسی آیت کا مطلب ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔ جو سیاق وسباق، کسی دوسری آیت یا تعامل اُمّت سے ہم نہیں سمجھ سکے ہیں۔ تو پھر ہم نبی اکرمؐ کی ثابت شدہ سُنّت کی طرف رجوع کریں گے۔ ثقہ راویوں سے جو چیز ہمیں حاصل ہوئی ہو اُس کی مدد سے ہم قرآن مجید کو سمجھیں گے۔ اب مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (سُورۃ توبہ آیت ۳۴) جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں اُن کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ صحابہ کرامؓ تو اہل زبان تھے۔ جب انہوں نے یہ آیت سنی تو پریشان

ہو گئے ۔ کنز کے معنی جمع کرنے کے ہیں خواہ تھوڑا مال ہو یا زیادہ اُنہوں نے کہا أینالم یکنز۔ ہم میں سے کون ہے جس کے پاس کنز نہیں ہے ۔ تھوڑا بہت تو سونا چاندی تقریباً سب کے پاس ہے ۔ اب کیا عذاب جہنّم کی سب کے لئے بشارت ہے ؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں رسُول اکرمؐ کی خدمت میں جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ اس کا کیا مطلب ہے ؟ ابوداؤد کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا ۔ ما أدی منہ زکواۃ فلیس بکنز جس مال میں سے زکواۃ نکال دی جائے ۔ شریعت کے مطابق غریبوں کا حق دیا جائے۔ وہ کنز نہیں رہتا ۔ اب یہاں اگر آپ لُغت کے لحاظ سے دیکھیں گے تو کنز بن جاتا ہے۔ خواہ تھوڑا مال ہو یا زیادہ ۔ لیکن رسُول اکرمؐ نے اس کی تشریح کر دی اور ایک دوسری حدیث میں آتا ہے ۔ آپؐ نے فرمایا : اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یفرض الزکواۃ الا لیطیّب ما بقی من اموالکُم ۔ اللہ تعالےٰ نے زکواۃ اس لیے فرض کی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے باقی ماندہ مال کو پاک کر دے ۔ زکواۃ نکالنے کے بعد جو مال بچے گا وہ مال پاک ہوگا ۔ یہ مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سُنّت اور حدیث کے محتاج ہیں ۔ منکرینِ حدیث یہ کہہ دیتے ہیں کہ کیا قرآن ناقص ہے ؟ کیا قرآن ادھورا ہے جو ہم سُنّت کو مانیں ۔ کیا ہمارے لئے قرآن کافی نہیں ہے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید تو اپنے مطالب میں ناقص اور ادھورا نہیں ہے لیکن ہم اس کو سمجھنے کیلئے سُنّت کے محتاج ہیں ۔ جس طرح کہ ہم عربی زبان کے محتاج ہیں ۔ کیا کوئی صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر عربی زبان جانے وہ قرآن مجید سمجھ جائیں گے ۔ قرآن مجید عربی زبان میں ہے تو عربی زبان بھی سمجھیں اس کے معنی یہ نہیں کہ چونکہ آپ عربی زبان کے محتاج ہیں اس لئے قرآن مجید ناقص ہے ۔ قرآن مجید محتاج نہیں، ہم عربی زبان کے محتاج ہیں۔ اس طرح ہم محتاج ہیں رسُول اکرمؐ کی تشریح و تفسیر کے کہ جس ہستیؐ پر قرآن مجید نازل ہوا تھا ۔ اس ہستیؐ نے اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا ۔ اگر ہم اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور اپنی طرف سے مطلب بیان کرتے ہیں تو حقیقت میں ہم سیدھے راستے سے بھٹک جاتے ہیں اور قرآن مجید کا جو اصل مقصد ہے کہ لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور ۔ کہ بجائے ظلمات سے نکلنے کے ہم ظلمات ہی میں ڈوبے رہیں گے کہ ایک تاریکی سے نکلیں گے دوسری تاریکی میں چلے جائیں گے ۔ اسی طرح

قرآن مجید میں آتا ہے۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین۔ (سورۃ نساء آیت ۱۱)

یہاں پر کوئی تمہید نہیں ہے کیسی اولاد ہو۔ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ "لایرث القاتل" کہ بیٹے نے اگر باپ کو قتل کر دیا تو وارث نہیں ہوگا۔ حدیث نے یہ مفہوم بیان کر دیا کہ اختلافِ دین ہونے کی بنا پر یا قاتل ہونے کی بنا پر وہ اپنے باپ کا وارث نہیں ہو سکتا۔ یا جیسے قرآن مجید میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں صرف اشارہ ہے لیکن حدیث میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس آیت کے کیا معنیٰ ہیں۔ قرآن مجید میں محرماتِ ابدیہ کا بیان ہوا ہے۔ مائیں حرام ہیں، بیٹیاں حرام ہیں، بہنیں حرام ہیں۔ لمبی آیت ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ اس کے علاوہ تمہارے لئے حلال ہے۔ لیکن رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ آپؐ کا اجتہاد بھی وحی کی روشنی میں تھا۔ آپؐ نے فرمایا: لا یجمع بین المرأۃ وعمتہا وبین المرأۃ وخالتہا۔ کہ پھوپھی اور بھتیجی خالہ اور بھانجی کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں رکھنا حرام ٹھیرایا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔ ان تجمعوا بین الاختین۔ دو بہنوں کا جمع کرنا حرام ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ جب دو سگی بہنیں سوکنیں بن جائیں گی تو سوکن کے رشتہ میں ایک قسم کی رقابت ہوتی ہے عداوت ہوتی ہے۔ اور بہنیں ہونے کا رشتہ یہ چاہتا ہے کہ دونوں میں محبت ہو۔ گویا اس طرح سے دونوں میں قطع تعلق ہو جائے گا۔ اسی لئے ایک حدیث میں ہے ابن حبان کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔ اذا فعلتم ذالک قطعتم ارحامکم۔ کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم اپنے رشتوں کو کاٹ ڈالو گے۔ دو بہنوں میں محبت ہوتی ہے وہ نہیں رہے گی۔ ٹھیک اسی طرح پر پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی ان کا قریبی رشتہ ہے۔ دونوں میں محبت ہے۔ یہ فطری چیز ہے اب اگر دونوں بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں ہوں گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ دونوں سوکنیں بن جائیں گے آپس میں رقابت اور عداوت پیدا ہوگی۔ اور اُن کی محبت نفرت میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ حکیمانہ تعبیر حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ اس قسم کی روایات کو اگر آپ تسلیم نہیں کریں گے تو اسلامی نظام قائم نہیں ہوگا۔ قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے

اخبار واحاد یعنی وہ روائتیں جن کے بیان کرنے والے ایک یا دو یا تین ثقہ راوی ہیں تو ایسی صحیح روایات کو بھی قرآن فہمی میں دخل ہے اور ان کے بغیر ہم قرآن مجید کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں لیکن وقت چونکہ کافی ہو رہا ہے اس لئے میں اختصار سے کام لے رہا ہوں۔

قرآن فہمی کا پانچواں ذریعہ

اس کے بعد ایک ذریعہ ہے آثار صحابہؓ کا صحابہ کرامؓ کے اقوال، خاص کر عبداللہ ابن مسعودؓ عبداللہ ابن عباسؓ ابی ابن کعبؓ یہ لوگ جنہوں نے قرآن مجید کی خدمت کی ہے۔ اِن کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ لہٰذا ان کی تفسیر کو مانا جائے گا۔ اگر کہیں ان میں اختلاف ہو تو جو قول قرآن مجید سے زیادہ قریب ہو اُس کو لیا جائے گا۔ یہ بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال لیجئے۔ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں نقل کیا ہے۔ کہ ایک شخص حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اس میں آیات میں تعارض پایا جاتا ہے۔ ٹکراؤ اور تصادم پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ ہاں ہے ایک جگہ نہیں ہے تو وہاں ہم کیا کریں۔ انہوںؓ نے کہا کہ بتاؤ وہ کون سی آیات ہیں تاکہ میں بھی جانوں کہ تمہارے ذہن میں کیا خلجان ہے۔ سائل نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آتا ہے کہ قیامت کے دن جب مشرکین پہنچیں گے، جب قیامت قائم ہوگی تو وہ اللہ تعالےٰ کے دربار میں جاکر کہیں گے۔ واللہ ربنا ما کنا مشرکین (سورۃ انعام) قسم خدا کی ہم تو مشرک نہیں تھے۔ ہم نے تو شرک نہیں کیا۔ وہ انکار کریں گے یعنی اس طرح وہ اپنے شرک کو چھپائیں گے۔ دنیا کے جیسے رشوت خور کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم نے تو رشوت نہیں لی۔" اور دوسری آیت میں آتا ہے ولا یکتمون اللہ حدیثا۔ اور وہ اللہ تعالےٰ سے کوئی کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔ یہاں تعارض ہوگیا۔ کہ مشرکین نے چھپایا تو ہے جیسا کہ پہلی آیت میں ہے اور دوسری آیت میں آتا ہے کہ وہ چھپا نہیں سکیں گے۔ تو اس کا کیا مطلب ہے۔ اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ ایک وقت میں نہیں دو وقت میں ہے۔ شروع میں جاکر تو کفار یہ سمجھیں گے کہ یہ دربار بھی ہمارے دنیاوی حکام اور بادشاہوں کی طرح ہے۔ اگر ہم یہاں جھوٹ بول دیں اور کچھ چھپا لیں تو ہو سکتا ہے کہ کام چل جائے۔ اس بنا پر وہ کہیں گے کہ واللہ ربنا ما کنا مشرکین۔ وہ اس

طرح جھوٹ بول دیں گے کیونکہ انہیں جھوٹ بولنے کی عادت رہی ہے ۔ لیکن اس کے بعد پھر یہ ہوگا کہ :۔ اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ مہر لگا دیں گے ۔ جب مہر لگ جائے گی تو یہ اعضاء و جوارح گواہی دیں گے ۔ منہ بند، زبان بند، مہر لگ گئی ۔ اب یہ اعضا و جوارح یہ ہاتھ پاؤں، آنکھ کان گواہی دیں گے ۔ کہ کیا دیکھا تھا، ہاتھوں سے کیا پکڑا تھا ۔ قدم کہاں کہاں بڑھائے تھے، اُس وقت کوئی بات نہیں چھپائی جا سکے گی ۔ تو یہ دو مرحلے اور دو وقت ہیں ۔ اب یہ ایک صحابیؓ کی تفسیر ہے ۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ لوگ حدیث میں اتنے مشغول ہو گئے ہیں کہ قرآن بھول گئے اور قرآن سے تعلق کم ہو گیا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود محدثین نے جو خدمت کی ہے وہ تو قرآن مجید کی خدمت ہے اب یہی دیکھئے کہ سائل نے چار آیات پیش کیں اور ان سب کا جواب عبداللہ ابن عباسؓ دیتے ہیں امام بخاریؒ اس کو تفسیر سورہ حٰمٓ سجدہ میں نقل کرتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث جو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں ۔ وہ حقیقت میں قرآن مجید سے قریب ہوتے ہیں نہ کہ دُور ۔ اسی طرح ایک اور تفسیر سُنئے ۔ آج کل جو غلط ماحول چل رہا ہے اُس میں شاید یہ تفسیر نہایت اچنبھے سے سُنی جائے ۔ لیکن بہرحال ایک حق بات ہے اُس کو صاف کہہ دینا چاہیئے ۔ قرآن مجید میں آتا ہے : وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ ۔ کہ لوگوں میں سے وہ ہیں جو خریدتے ہیں لھو الحدیث یعنی ایسی باتیں جو لھو ہیں ۔ لھو کیا چیز ہے ۔ کُلّ کلام یُلھی عن ذکر اللہ ۔ ہر وہ کلام جو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے ۔ وہ لھو الحدیث ۔ اس کی تفسیر عبداللہ ابن مسعودؓ کرتے ہیں ۔ ترمذی کی روایت ہے ۔ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں ۔ وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قسم ہے اللہ کی جس کی سوا کوئی معبود نہیں ۔ لھو الحدیث کیا ہے ۔ اس کا بڑا مصداق کیا ہے ۔ الغنا ۔ یہ ناچ گانے، یہ گانے بجانے ۔ اس کا وہی نشہ ہے جو شراب کا ہوتا ہے اور دوسرے صحابی اس کی تفسیر کرتے ہیں ۔ الغنا ینبت الغناق ۔ غنا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے ۔ یعنی انسان اس طرح مست ہو جاتا ہے کہ اُسے نہ قرآن میں لذّت حاصل ہوتی ہے ۔ بس وہ چاہتا ہے کہ ریڈیو ٹی وی اور دوسرے ذرائع سے اچھے گلے رکھنے والے مُغنّی اور مغنیات کا گانا سُنتا رہے ۔ اس کو اُس میں لطف آتا ہے ۔ اسی میں اسے لذّت محسوس ہوتی ہے ۔ حضرت

عبداللہ ابن مسعود رضؓ نے لھو کی تفسیر غنا سے کی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے فہم کے لئے صحابہ کرام کی تفسیر بھی قابل اعتماد ہے - بہت سے وہ مقامات جو ہمارے لئے مشکل ہیں ان کو انہوںؓ نے حل کیا ہے - کیوں کہ اُن رضؓ کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا اور وہؓ جانتے تھے کہ رسُول اکرمؐ نے کیا تفسیر کی ہے - اور انہیںؓ کس طرح سمجھایا ہے -

اس کے بعد تابعینؒ کے اقوال ہیں - جو صحابہؓ کے شاگرد تھے - قتادہؒ ہیں اور دوسرے تابعین ہیں - اُن کے اقوال کو بھی دیکھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کہا ہے - تفسیر بالرّائے جب کوئی کرتا ہے تو اس سے قرآن مجید نعوذ باللہ بازیچۂ اطفال بن جائے گا - جیسے ایک صاحب نے تفسیر کی تھی - یایھا الذین امنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسُول واولی الامر منکم - اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول سے مراد انہوں نے مرکزِ ملّت لیا - یعنی وہ حکومت جو اللہ تعالٰی کے نظام ربوبیّت کو چلانے کے لئے قائم ہو - اولی الامر سے مراد انہوں نے تھانیدار وغیرہ کو لیا - اس طرح آدمی اپنے ذہن سے جو کچھ اس میں غلط سلط بیٹھ گیا ہے اس کے مطابق اپنی طرف سے تفسیر کرتا ہے اور قرآن مجید سے دُور ہو جاتا ہے -

قرآن فہمی کا چھٹا ذریعہ

ذریعہ قرآن مجید کے فہم کے لئے عربی زبان ہے - عربی زبان کا جاننا بھی ضروری ہے - عربی زبان نہیں جانتے لیکن قرآن مجید کے مفسّر بن جاتے ہیں - ایسے لوگ ہیں بلادِ عجم میں پاکستان میں ہندوستان میں پائے جاتے ہیں کہ وہ عربی نہیں جانتے لیکن انگریزی یا اُردو ترجمہ دیکھ کر تھوڑی سی ذہانت کی بنا پر مفسر قرآن بن گئے - یہ انتہائی غیر ذمہ داری ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر آدمی بیان کرتا ہو لیکن عربی زبان سے نابلد ہو - زبان کا ذوق پیدا کرو - یہ میں نہیں کہتا کہ سارے علّامہ بن جائیں لیکن جب تفسیر لکھنے بیٹھو، یا تفسیر کوئی بیان کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس نے اس عربی زبان کی تعلیم میں کچھ وقت لگایا ہو - اس کی مثالیں ملتی ہیں - مثلاً ایک تفسیر قادنیوں نے کی ہے - اُن کے خلیفہ نورالدین نے بھی کی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ یہ تفسیر معاندانہ ہے - جاہلانہ نہیں "فاضرب بعصاك الحجر" کے معنی یہ ہیں کہ اے مُوسیٰ تم سے لے جاؤ اپنی جماعت کو پہاڑ پر - ضرب کے معنی مارنے کے آتے ہیں - اس کے معنی سفر کرنے کے بھی آتے ہیں -

قرآن میں آتا ہے - اذا ضربوفی الارض اور عصا کے معنی جماعت کے بھی آتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے "شق عصا المسلمین" یہاں عصا کے معنی جماعت کے ہیں - تو جماعت بھی انہوں نے لغت سے ثابت کر دیا اور ضرب کے معنی ہی عربی لغت سے ثابت ہو گئے حجر کے معنی پتھر کے ہیں یعنی پہاڑ مراد ہے اس سے - پتھروں کا مجموعہ پہاڑ ہوتا ہے - قادیانی اور اسی قسم کے لوگ چونکہ حدیث کے منکر ہیں اس لئے انہوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ " اے موسیٰ اپنی جماعت کو پہاڑ پر لے جاؤ - پہاڑ کا سفر کراؤ - پہاڑ کی سیر کراؤ - حالانکہ عربی قاعدہ سے دیکھا جائے تو یہ ترجمہ غلط ہوگا - اگر تھوڑی سی عربی آتی ہو تو ایسا ترجمہ نہیں ہو سکتا - فاضرب بعصاك الحجر - ضرب کے بعد اگر 'فی' آئے تو اس کے معنی سفر کے آتے ہیں اگر 'فی' نہ آئے تب اس کے معنی چلنے کے نہیں آتے - سفر کرنے کے نہیں آتے - قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی آیا ہے - ضرب فی الارض - ضربوفی الارض - جہاں کہیں بھی چلنے اور سفر کرنے کے معنی میں آیا ہے وہاں اس کے بعد 'فی' آیا ہے - یہاں چونکہ 'فی' نہیں آیا اس لئے یہاں سفر کرنے کے معنی نہیں ہو سکتے - لغت اور عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر یہ ترجمہ کیا گیا ہے - اس لئے عربی جاننا ضروری ہے - کم سے کم اتنی عربی تو آئے تاکہ قرآن مجید کو سمجھ سکیں - ترجمہ کی مثال اس طرح سمجھئے کہ ایک چیز تو ہوتی ہے لسی اور ایک ہوتا ہے خالص دودھ - تو خالص دودھ میں جو مزہ ہوتا ہے وہ لسی میں نہیں ہے ترجمہ ترجمہ ہے - ترجمہ کے اندر بھی مترجم کا کچھ نہ کچھ تخیل آجاتا ہے - اس کے کچھ خیالات ہوتے ہیں - کچھ جذبات ہوتے ہیں جو اس میں آجاتے ہیں - لہذا ضروری ہے کہ عربی زبان کی نزاکتوں سے واقفیت ہو تو پھر قرآن مجید کا فہم، اس کی حلاوت، اس کا مٹھاس اور اس کی شیرینی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے - ورنہ ترجمہ سے صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حلال کیا ہے، حرام کیا ہے اللہ تعالیٰ کو کیا چیز پسند ہے کیا ناپسند ہے - میں سمجھتا ہوں کہ جو بوڑھے بوڑھے لوگ ہیں وہ عربی کیا پڑھیں گے لیکن جو نوجوان ہیں ان کو سوچنا چاہیئے کہ عربی زبان سیکھیں - جتنا وقت وہ اپنی معاش میں لگاتے اور دوسرے کاموں میں صرف کرتے ہیں اس میں روزانہ یا ہفتہ میں کم از کم دو تین گھنٹے عربی زبان سیکھنے کیلئے نکالیں - اگر وہ ایسا کریں گے تو حقیقت میں وہ قرآن مجید کے اور قریب ہو جائیں گے -

اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ لوگوں نے غلط انداز اختیار کیا ہے لیکن میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

عربوں کے تمدن اور اُن کی عادات سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ جس ماحول میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اُس سے بھی ہم باخبر ہوں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا۔ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم مکان کے پچھواڑے سے آؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ تم دروازہ سے داخل ہو۔ اب اس سے کیا سمجھا جائے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ کیوں فرمایا گیا ہے۔ یہ اُن کی عادت تھی کہ جب وہ طواف کرنے جاتے تھے اور طواف کر کے واپس آتے تھے تو جس دروازے سے جاتے تھے اُس سے واپس نہیں آتے تھے مقصد اُن کا یہ تھا کہ طواف کرنے کے بعد اب پاک ہو گئے ہیں اس لئے اُس ناپاک دروازے سے داخل نہیں ہوں گے بلکہ پچھواڑے سے داخل ہوں گے۔ اب اگر ہمیں اُن کی یہ عادت معلوم ہے تو قرآن مجید کا بیان سمجھ میں آجاتا ہے۔ قرآن مجید نے نیکی کے اس تصوّر کی تردید کی ہے کہ اگلے دروازہ سے نہ آیا جائے بلکہ پچھواڑے سے آیا جائے۔ یہ کوئی نیکی نہیں ہے۔ نیکی تو تقویٰ کا نام ہے تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ کا خوف اختیار کرو۔

اسی طرح قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے کتب سماوی بھی معاون ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ ایک بڑا لمبا معاملہ ہے۔ لیکن جو لوگ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کو سمجھیں تو ایسی تفسیر جس میں موازنہ کیا گیا ہو۔ وبضدها تتبين الاشياء ضد سے اشیا کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ نور کی قدر ظلمت سے ہوتی ہے۔ جب بجلی چلی جاتی ہے تو روشنی کی قدر ہوتی ہے جب بجلی آجاتی ہے تو روشن ہو جاتی ہے اور خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح پر بائبل اور تورات میں جو چیزیں ہیں انہیں سامنے رکھیں پھر قرآن مجید پڑھیں تو تو کہیں زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ اور بعض الفاظ کے اضافہ کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ ۝ (سورۃ قٓ۔ آیت ۳۸) کہ ہم نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ چھ دنوں میں۔ اور

ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی - یہ کیوں فرمایا گیا کہ ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی - آخر اس کی کیا وجہ ہے - کون ہے مسلمان جو ایسا سمجھے بلکہ یہ مشرکین کا بھی عقیدہ نہیں تھا کہ اللہ میاں تھک جاتے ہیں - لیکن جب تورات دیکھی - کتاب پیدائش میں لکھا ہوا ہے - اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ میاں نے چھ دن میں آسمان اور زمین بنائے اور ساتویں دن آرام کیا - تو قرآن مجید نے کہا کہ ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی - اگر تورات کا بیان سامنے ہو تو وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ کے سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے - افسوس ہوتا ہے کہ اللہ میاں کی طرف انہوں نے کیسی صفت منسوب کر دی۔ اسی طرح سورۃ والشمس میں آتا ہے - فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ (آیت ۱۵) قوم ثمود کو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے تباہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ کسی کے انجام کا خوف نہیں رکھتا - اُس نے تباہ کر دیا ہے - اُسے کوئی خوف نہیں ہے - کوئی ڈر نہیں کہ کیوں تباہ کیا ہے - یہ اس وجہ سے فرمایا کہ تورات میں یہ ہے - کتاب الخروج میں لکھا ہے کہ قوم ثمود کو تباہ کرنے کے بعد اللہ میاں پچھتائے - یعنی خدا پچھتایا - افسوس ہوا نادم ہوا - اس لئے قرآن مجید میں فرمایا - اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کو اس کے گناہوں کی وجہ سے تباہ کر دیا - اُس کے انجام سے اللہ تعالیٰ کو کوئی خوف نہیں - پچھتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - وہ تو قادرِ مطلق ہے - اُس کو انسانوں پر قیاس کیوں کرتے ہو یہ مختلف ذرائع ہیں جن کی بنا پر ہم قرآن مجید کو سمجھ سکتے ہیں غور کر سکتے ہیں اس میں جو موٹی موٹی چیزیں ہیں وہ تو ابتدائی ہیں - وہ تو لازمی ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید سے حدیث سے اور پھر لُغت سے - اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ لُغت کافی نہیں ہے کہ سُنت کو آپ چھوڑ دیں بیٹھیں محض لُغت کو لے بیٹھیں - قاموس یا المنجد کو لے کر بیٹھ جائیں کہ قرآن کو حل کر لیں گے یہ بھی غلط ہے - بہت سے کلمات ایسے ہیں - بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ جن کی تشریح شارح نے کی ہے - لُغت میں اس کے کچھ اور معنی ہیں - اب لُغت میں صلوٰۃ کے معنیٰ دُعا کے آتے ہیں - لیکن صلوٰۃ صرف دُعا تو نہیں ہے - صلوٰۃ ایک خاص اصطلاح ہے دین کی - حج کے معنی عربی زبان میں قصد کرنے کے آتے ہیں - لیکن شریعت میں اس اصطلاح کے ایک خاص معنیٰ ہیں - یہ ایک عبادت ہے

اس کے خاص آداب، خاص شرائط اور خاص تعریف ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح صوم ہے۔ صوم۔ صبر کے معنی میں آتا ہے لیکن شریعت کے اندر اس کے کچھ اور معنی ہیں۔ لہٰذا بہت سے الفاظ شریعت کے ایسے ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لئے لغت کافی نہیں ہے۔ لیکن بہرحال بہت سے الفاظ قرآن مجید میں ایسے بھی ہیں کہ جن کے لئے ہمیں لغت کی ضرورت پڑتی ہے نیز جاہلیت کے اشعار کی مدد سے بھی ہم قرآن مجید سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن فہمی کی راہ کے موانع

کچھ موانع اور رکاوٹیں ہیں جو قرآن فہمی میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ انسان ایک خیال اپنے دل میں جما لیتا ہے اور پھر قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے کہ میں نے جو خیال اپنے دل میں جما لیا ہے یا کسی قوم سے چرا لیا ہے یا کسی کی نقالی کی ہے۔ وہ خیال، وہ نظریہ، وہ فکر اب میں قرآن مجید سے ثابت کروں حالانکہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ انسان خالی الذھن ہو کر پڑھے کہ اس مسئلہ میں قرآن مجید کیا رہنمائی دیتا ہے۔ تب تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ ورنہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک اشتراکی ذہن ہے اب وہ اگر قرآن مجید پڑھے گا تو کوشش یہ کرے گا کہ ہر جگہ وہ ایسی آیت ڈھونڈے یا ایسا معنی بیان کرے کہ جس سے انفرادی ملکیت کی نفی ہو اور قومی ملکیت ثابت ہو۔ یا ایک سرمایہ دار یا بہت بڑا جاگیردار ہے۔ اس کی خواہش یہ ہوگی کہ میں ایسی آیتیں تلاش کروں اور ایسا مطلب نکالوں کہ جس سے سود بھی جائز ہو جائے ساری چیزیں جائز ہو جائیں۔ حرام بھی حلال ہو جائے۔ یہ پہلو انتہائی خطرناک ہے۔ اس طریقہ کی بنا پر قرآن مجید سے دور ہو جائیں گے۔ ایک مثال یہ ہے کہ جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن ہی کافی ہے۔ اب جب وہ قرآن مجید پڑھتے ہیں تو ہر جگہ انہیں نظر آتا ہے کہ حدیث حجت نہیں ہے۔ ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں انہوں نے کتاب لکھی "مقام حدیث"۔ اس میں لکھا فبای حدیث بعدہٗ یومنون۔ اس کا ترجمہ کیا۔ کس حدیث پر ایمان لائیں گے قرآن کے بعد؟ یہاں حدیث کا انکار کر دیا۔ حالانکہ یہاں حدیث کے لغوی معنی ابرار ہیں۔ بات کے معنی ہیں یعنی کسی بات پر؟ یا مثلاً سورہ لقمان کی یہ آیت پڑھ ڈالی۔ وَمِنَ النَّاسِ

مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۝ (آیت ۶)
(ترجمہ ایک منکرِ حدیث نے اس طرح کیا ہے کہ لوگوں میں سے وہ ہیں جو خریدتے ہیں حدیث کے مشغلے جو دماغ میں پہلے سے خیال سمایا ہوا ہے لھوالحدیث سے وہی مراد لے لیا۔ حالانکہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ لہوالحدیث کے معنی ہیں ہر وہ کام ہر وہ بات جو اللہ کے ذکر سے غافل کرنے والی ہو۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ لفظ حدیث جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس کے معنیٰ بات کے، کلام کے ہیں۔ اب یہ کلام اللہ تعالےٰ کا بھی ہو سکتا ہے اور رسُول اکرمؐ کا بھی ہو سکتا ہے۔ کلام صحابہؓ اور مومنین کا بھی ہو سکتا ہے اور یہ کلام کافروں، مشرکوں اور منافقوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں لغوی معنی مراد ہیں حدیث کے ؛ شرعی معنی مراد نہیں ہیں۔ شرعی معنیٰ اور ہیں، اصطلاحی معنیٰ اور ہیں۔ اور لُغت میں اور ہیں۔ قرآن مجید میں جو حدیث کا لفظ آیا ہے وہ لغت کے لحاظ سے آیا ہے، اس سے حدیث رسُول مراد نہیں ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ۝۔ (سورۃ زمر۔ آیت ۲۳) اللہ تعالےٰ نے اُتاری ہے احسن الحدیث۔ یعنی بہترین۔ حدیث۔ یہاں قرآن مجید مراد ہے۔ یعنی تمام کلاموں میں بہترین کلام۔ یا جیسے قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَا کَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ (سُورہ یوسف آیت ۱۱۱) حضرت یوسفؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ بات جو ہم نے بیان کی ہے کوئی گھڑی ہوئی نہیں ہے۔ کوئی افترا نہیں ہے۔ اسی طرح فرمایا سورۃ کہف کے شروع میں : فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ۝ (آیت ۶) کہ اے نبیؐ! تم اپنے آپ کو ہلاک کر دوگے اس افسوس میں کہ یہ لوگ اس حدیث پر ایمان نہیں لاتے۔ یہاں حدیث سے مراد کیا ہے ؟ قرآن مجید۔ کلام اللہ کو بھی حدیث کہتے ہیں اسی طرح رسُول اکرمؐ کی بات کو بھی قرآن مجید میں حدیث کہا گیا ہے۔ سورۃ تحریم میں فرمایا :۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ط (آیت ۳) کہ جب کہ نبی اکرمؐ نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔ صحابہ کرامؓ کی بات کو اور مومنین کی بات کو بھی حدیث کہا گیا ہے۔ سُورۃ

الاحزاب میں فرمایا: وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ط اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۔ (آیت ۵۳) کھانا کھانے کے بعد نبی اکرمؐ کے گھر میں بیٹھ کر گپ شپ مت کرو۔ اس سے نبی اکرمؐ کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ حدیث کا لفظ کفار اور مشرکین کے اقوال اور اُن کی بات چیت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا: ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ۔ اور دوسری آیت میں فرمایا ۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۔ (سورۃ نساء آیت ۱۴۰) ۔ اور جب کوئی ایسی بات کر رہے ہوں جس میں استہزاء ہو۔ مذاق اڑا رہے ہوں تو مسلمانوں کو چاہیئے اُن کے پاس مت بیٹھیں۔ اُن کی مجلس میں نہ بیٹھیں یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں۔ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمارا جو خیال اور عقیدہ ہے اُس کے مطابق قرآن مجید سے کھینچا تانی کر کے مسئلہ نکالیں دراصل یہ قرآن فہمی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید دشمنی ہے۔ اسی طرح ایک موٹی سی بات ہے جسے بیان کر دوں۔ ممکن ہے۔ آپ کہیں کہ یہ اختلافی مسئلہ تو وہ ہوتا ہے جس میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف رہا ہو تو اس کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ کسی حدیث یا آیت کے سمجھنے میں نیک نیتی سے آدمی اجتہاد کرتا ہے۔ اور غلطی ہو سکتی ہے۔ صحابہ کرامؓ ہیں ائمہ مجتہدینؒ ہیں محدثینؒ ہیں۔ ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان اختلافی مسائل کو بنیاد بنا کر لڑنا جھگڑنا تو غلط ہے۔ لیکن کوئی مسئلہ اب پیدا کر دیں اور پھر قرآن مجید کو لائیں مثلاً رسول اکرمؐ بشریت سے بالاتر تھے۔ انسانیت سے بالاتر تھے۔ اللہ تعالےٰ کے ساتھ شریک تھے یا نورٌ من نور اللہ تھے۔ بہر حال آپ انسانیت سے بالاتر تھے۔ اب یہ عقیدہ ذہن میں بیٹھا اور قرآن مجید میں ڈھونڈنا شروع کیا کہ ہمارا یہ نظریہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں۔ انہوں نے ایک آیت ڈھونڈ نکالی ہے سورۃ تغابن کی: ۔ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا ۔ اس کا ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا بشر ہمیں ہدایت دیتے ہیں تو کافر ہو گئے۔ کافر اس لئے ہو گئے کہ انہوں نے انبیاء کرامؑ کو بشر کہدیا۔ حالانکہ مطلب یہ نہیں ہے۔ پوری آیت یہ ہے۔ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ

يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ آیت ۶)
یہاں معنیٰ کچھ اور ہیں۔ معنیٰ یہ ہیں کہ کفار نے کہا چونکہ یہ انبیاء کرام انسان ہیں لہذا
ہم اُن کی دعوت قبول نہیں کرتے۔ فرشتے آنے چاہئیں۔ اس آیت کی تفسیر دوسری
آیت میں موجود ہے۔ فرشتے آئیں وہ آکر ہمیں سمجھائیں۔ وہ ہمیں ہدایت دیں تو ہم
مانیں گے۔ لیکن یہ انسان ہیں ہمارے جیسے ہی ہیں۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ
يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (سورۃ الفرقان آیت ۷) رسول کو
کیا ہو گیا ہے کہ بازاروں میں چلتا ہے اور (ہماری طرح) کھانا کھاتا ہے۔ انکار کی وجہ
دراصل یہ ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی فہم کے لئے سب سے بڑی ضرورت
اس بات کی ہے کہ ہم ہر قسم کے تعصب سے، ہر قسم کی عصبیت سے پاک ہو کر اگر قرآن مجید
کو پڑھیں گے۔ تب تو اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی عقیدہ، کوئی فکر، کوئی ازم اپنے
ذہن میں لے کر قرآن مجید کو سمجھنا چاہئیں گے تو قرآن مجید سے اور دُور ہو جائیں گے۔
لوگوں نے تو۔ یہاں تک مذاق کیا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ
الْحَدِيْثِ۔ تو آپ سن چکے ہیں۔ اسی طرح ایک چیز اور بھی ہے لفظ ہر ہنسی کی بات
ہے۔ لیکن میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس طرح مسلمان فرقہ وارانہ عصبیت کی بنا پر
قرآن مجید سے دُور ہو گئے۔ ایک صاحب نے کہا وہ حضرت علیؓ کے بہت چاہنے
والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت ابراہیمؑ بھی شیعہ تھے۔ اور قرآن مجید کی یہ آیت
پڑھ ڈالی؛ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ (سورۃ الصّٰفّٰت۔ آیت ۸۳)
یعنی شیعہ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ۔ سُنّی کون سے کم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا اچھا،
اور قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ دی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا
شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ط (سورہ انعام آیت نمبر ۱۶۰) جنہوں نے دین
میں تفریق ڈالی وہ سب شیعہ ہیں۔ اور دوسری آیت پڑھ دی۔ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ
مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ۝ (سورۃ مریم
آیت نمبر ۶۹) حالانکہ شیعہ کے معنیٰ جماعت کے ہیں۔ حدیث معنیٰ السمیع میں
غلطی کی گئی ہے وہی یہاں کی جا رہی ہے۔ شیعہ کا جو مفہوم مشہور ہو گیا۔ اُس کو سامنے
رکھا گیا ہے۔ لفظ شیعہ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس کے معنیٰ جماعت کے ہیں۔ گروہ کسی

کا ہو۔ وہ اچھے بھی ہو سکتے ہیں بُرے بھی ہو سکتے ہیں لیکن وہ اس کے اپنی جماعت پر یا گروہ پر یا اپنے فرقہ پر چسپاں کرنے کے لئے یا ان کا جواب دینے کے لئے قرآن مجید کو استعمال کرتے ہیں۔ مذہبی فرقہ وارانہ ذہنیت سے بھی انسان قرآن مجید سے دور ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کو ایک کھیل بنا لیتا ہے۔

قرآن مجید کے موانع میں سے ایک یہ ہے کہ انسان قرآن مجید پڑھتا ہے لیکن اس کو سمجھتا نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو بس تبرکاً پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ایک بار کہا تھا کہ سب سے مظلوم کتاب قرآن مجید ہے۔ اس لئے کہ ساری کتابیں اور ساری تحریریں سمجھ کر پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن مجید ہی ایک ایسی مظلوم کتاب ہے کہ جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہم بے سمجھے ہی اس کو پڑھ لیں تو یہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اور اس طرح قرآن مجید کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقتاً قراءٔ کا لفظ جو قرآن و حدیث میں آیا ہے یا مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کے ارکان قراء تھے۔ قراء سے مراد جاہل قاری نہیں ہیں۔ وہ مخرج تو نکال سکتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے معنیٰ نہیں جانتے۔ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کے جو ارکان تھے وہ قراء تھے۔ یعنی وہ علماء تھے، کتاب و سنّت کے عالم تھے۔ قراء کے معنیٰ پڑھنے کے ہیں کہ آدمی سمجھ کر پڑھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بے سمجھے اگر کسی نے قرآن مجید پڑھا تو ثواب نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ دینے والا ہے۔ اُس کے خزانہ میں کیا کمی ہے میں اس سے بحث نہیں کرتا۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ قرآن مجید کا تقاضا کیا ہے۔ وہ ہم سے چاہتا کیا ہے؟ پھر ہم میں ایک اور عجیب ہے۔ ہم نے قرآن مجید کو تبرک سمجھا ہوا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ بادشاہی مسجد لاہور میں ایک صاحب بڑی محنت کر رہے ہیں۔ انہوں نے سونے کے تاروں سے قرآن مجید لکھنا شروع کیا ہے بلکہ ختم کر لیا ہے۔ اب لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ گویا یہ بڑا کمال ہے۔ اب قرآن مجید سونے کے تاروں سے لکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ سوال یہ ہے کہ آپ قرآن مجید پڑھنے کا اور اُس کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایسا طریقہ اختیار کیجئے کہ جس سے دل کے تار ہل جائیں۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ (سورۃ یونس۔ آیت ۵۷) یہ تمہارے رب کی طرف سے نصیحت ہے اور سینوں میں جو روگ ہیں اُن

کے لئے شفا ہے۔ ویسے آج کل ایک اور بیماری ہے ممکن ہے آپ لوگوں کو ناگوار ہو۔ وہ یہ کہ آج کل تعویذ گنڈے بہت چل رہے ہیں۔ بہت سی کتابیں لکھ دی گئی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید نزلہ زکام کھانسی بخار کے علاج کے لئے ہے۔ عورت کے بچہ ہونے والا ہے تو فال کھول جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے ایسا کرو ویسا کرو۔ گویا کہ یہ ہمارے حکیم و ڈاکٹر سب بیکار ہو گئے۔ اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن مجید بس اسی مقصد کے لئے نازل ہوا تھا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ توپ تو بنی تھی دشمنوں کو مارنے کے لئے لیکن ہم اس سے مچھر مکھی مار رہے ہیں۔ مچھر اور مکھی اس سے مر تو جائیں گے لیکن توپ اس لئے نہیں بنائی گئی۔ قرآن مجید کی آیتوں کے نقش بنائے جاتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑا کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس طرح یہ لوگ قرآن مجید سے دور کر رہے ہیں۔ ایک اور بڑا مسئلہ ہے اس کا آپ کے ہاں عام رواج ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے بہت سے حضرات اس کو نامانوس محسوس کریں وہ ہے۔ قرآن خوانی۔ قرآنی دانی کی بجائے قرآن خوانی۔ قرآن خوانی کا رواج بہت ہے۔ اگر کوئی مر جائے اور اس نے ساری عمر قرآن نہ پڑھا ہو، اور پڑھنے والے کو بھی قرآن پڑھنا نہ آتا ہو لیکن لوگ جمع ہوتے ہیں، تیجا چالیسواں کیا کچھ ہوتا ہے۔ تاکہ قرآن مجید پڑھ کر مُردے کو ثواب پہنچایا جائے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ قرآن مجید میں کتنی بار آیا ہے اقیموا الصلوٰۃ۔ نماز قائم کرنے پر تو عمل نہیں ہوتا لیکن آپ قرآن خوانی کر رہے ہیں۔ قرآن خوانی کافی نہیں ہے قرآن دانی ضروری ہے۔ لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ قبر میں جو دفن ہو گیا ہے قرآن مجید اس کے لئے اس کو بخشوانے کے لئے ہے اور بس۔ ہمارے لئے نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے لئے ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ تمہارے دلوں میں جو روگ ہیں، جو اخلاقی بیماریاں ہیں جو روحانی امراض ہیں جو عقائد کی بیماریاں ہیں اُن کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہ اخلاقی اور روحانی لحاظ سے جو چلتے پھرتے مُردے نظر آ رہے ہیں اُن کا علاج قرآن میں ہے جو قبر میں چلے گئے اُن کا معاملہ اللہ کے ہاں ہے۔ اب آپ چاہے کتنا ہی پڑھتے رہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے عیسائیوں میں رواج ہوا تھا کہ جب کوئی مر گیا تو نجات نامہ، ویزا، جنت کا پرمٹ دیا کرتے تھے۔ مُردہ کے سینے پر لکھ کر لگا دیا کرتے تھے کہ یہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ سیدھا جنت میں جائے گا۔

یسوع مسیحؑ کی بادشاہت میں جائے گا۔ اسی طرح ہمارا بھی یہ عقیدہ ہے، یہ خیال ہے یہ رواج ہو گیا ہے کہ ہم ایصالِ ثواب کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایصال ثواب غلط ہے۔ ایک تو موجودہ رواج ہے اجتماعی شکل میں، یہ غلط ہے۔ ایک یہ کہ انفرادی طور پر کوئی کچھ پڑھ لیتا ہے۔ ثواب پہنچا دیتا ہے۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے سلف میں بعض اس کے قائل ہیں بعض قائل نہیں ہیں۔ جس کو صدمہ پہنچا ہے وہ قرآن مجید پڑھ کے مغفرت کی دُعا کرے تو اس کی گنجائش شریعت میں نکل سکتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ کہ برادری کے تمام لوگ جمع کر لئے جاتے ہیں اور جس کے ہاں غمی ہوئی ہے اُسے کھانا بھی کھلانا پڑتا ہے آخر یہ کیا چیز ہے؟ کہ قرآن مجید قبر والوں کے لئے ہے۔ جو قبر سے باہر ہیں اُن کے لئے نہیں ہے؟ یہ چیز درحقیقت ہمیں قرآن مجید سے دُور کر رہی ہے۔ یہ بڑا افسوسناک طرزِ عمل ہے۔ یہ قرآن فہمی اور قرآن دانی میں رُکاوٹ ہے۔ اس کے علاوہ لوگ قرآن مجید سے فال نکالتے ہیں۔ عدالتوں میں قرآن مجید پر حلف اٹھاتے ہیں۔ سچّے ہوں یا جھوٹے ہوں قرآن مجید کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ دُلہن اگر جا رہی ہو تو قرآن مجید اچھے غلاف میں لپیٹ کر جہیز میں دیدیا جاتا ہے چاہے وہ ایسے ساری عمر نہ پڑھے۔ جذبہ تو بہت اچھّا ہے لیکن پہلے اُسے پڑھایا تو ہوتا۔ پہلے اُس میں قرآن مجید کا ذوق و شوق تو پیدا کیا ہوتا تاکہ بعد میں اپنے شوہر کے ہاں جائے تو سمجھ کر پڑھ سکے، اس پر عمل کر سکے اور اپنے بچوں کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تربیت دے سکے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اسلام آئے اور قرآن مجید اور سنت کا نظام جاری ہو تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو سمجھا جائے اور اُسے صحیح معنی میں سمجھایا جائے۔ اللہ تعالےٰ عمل کی توفیق دے اور جو باتیں میں نے صحیح بیان کی ہیں۔ اللہ تعالےٰ اُنہیں قبول فرمائے اور جو غلط بات کہی ہے۔ اللہ تعالےٰ آپکے سینے سے اُسے محو کر دے۔

وَآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین ۔

قال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ

بخاریؒ و مسلمؒ ——— عن عثمانؓ ابن عفان

اِسلام — ایک مکمل ضابطۂ حیات

محمد یُونس جنجوعہ ، ایم - اے - بی - ایڈ

اِسلام بلاشبہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ نبوّت اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے لیکن آج مسلمان اسلام کو مکمل ضابطہ حیات کے طور پر تسلیم تو کرتے ہیں لیکن خود اپنے عمل سے اس کی نفی کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ اسلامی تعلیمات سے واقف نہیں اور جدید علوم حاصل کرکے ان کی چمک دمک سے مرعوب ہوگئے ہیں اور مختلف نظریہ ہائے زندگی کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یا خود اسلام کے اصولوں کو قابلِ ترمیم سمجھتے ہوئے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق اُنہیں ڈھالنا چاہتے ہیں ۔ شاید انہیں یہ بات بھول جاتی ہے کہ اسلام اللہ تعالےٰ (خالقِ کائنات) کا پسندیدہ طرزِ زندگی ہے ۔ چونکہ اللہ ربّ العزت ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے اسی طرح اس نے جو دین بنی نوع انسان کیلئے پسند کیا وہ بھی بے عیب ہوگا نیز یہ کہ اسی اسلام کو بطورِ دین کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بالفعل نافذ کرکے مسلمانوں کے حوالے کیا ۔ اور آپؐ کے خلفائے راشدین نے بھی اُس کو اپنے اپنے دورِ خلافت میں جاری رکھا اور تاریخ عالم نے دیکھا امن وسکون ۔ خوشحالی اور فارغ البالی میں وہ دور اپنی نظیر نہیں رکھتا ۔

آج خود مسلمان اسلام سے مطمئن نہیں ۔ لاتعداد فرقے پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کے چہرے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جب غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جائے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ اسلام کے کس فرقے میں شامل ہوں ۔ یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ خود مسلمان مختلف اغراض و مقاصد کے حصول میں اس حد تک منہمک ہوگئے کہ اسلامی تعلیمات کے سر چشموں کو فراموش کر بیٹھے ۔ اسلام میں ذاتی پسند کی چیزوں کو داخل کر دیا اور اس طرح مسخ

شدہ اسلام کے حامل بن کر ہر قسم کی برکات سے محروم ہو گئے۔

قرآن حکیم میں جو اسلامی تعلیمات کا اوّلین ماخذ ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا "اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بندی نہ کرو"۔ مسلمانوں نے فرقہ بندی کر کے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہے۔ اور وہ اپنے مخصوص فرقے کو ہی اسلام سمجھتا ہے حالانکہ اُس کی غلطی واضح ہے۔ صحابہ کرام صرف مسلمان تھے۔ ان کا کوئی فرقہ یا ٹولہ نہ تھا۔ انہوں نے اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اُن کے سامنے رسول پاکؐ کا فرمان موجود تھا "میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم اُن کو اختیار کئے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے ایک کتاب اللہ۔ دوسری میری سنتؐ"۔ صحابہ کرامؓ نے قرآن و سنت کے اتباع کی جو مثالیں قائم کی ہیں وہ اسلامی تاریخ کا درخشندہ باب ہے لیکن یہاں طوالت کی خاطر اس سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔

خلفائے راشدین کے بعد کے لوگوں کے لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا "تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے پر چلو اور خلفائے راشدینؓ کی راہ اختیار کرو"۔ اللہ تعالےٰ کی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے خلفائے راشدین پر کہ جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کے اعتماد کو ذرہ برابر ٹھیس نہ پہنچائی اور اپنے زمانے میں سُنت نبوی پر سختی سے عمل پیرا رہے اور کسی ایسی چیز کو اسلام میں داخل نہ کیا جو آنحضرتؐ نے اسلام میں شامل نہ کی تھی اس طرح خلفائے راشدین بھی دین اسلام کو خالص حالت میں چھوڑ کر رخصت ہوئے۔

اصولی طور پر تو اسلام کی تکمیل بطور ضابطہ حیات خود ربّ العزت نے فرمادی جب آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری ایام میں یہ اعلان کیا گیا کہ "آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین (ضابطہ حیات) پسند کیا"۔ یوں اللہ تعالےٰ نے ضابطہ حیات مکمل اور تمام صورت میں مرحمت فرمایا اور پیغمبر اسلامؐ نے اُس کو نافذ کیا۔ لیکن اُمت کی بدقسمتی کہ نظری طور پر تو دین کو مکمل ضابطہ حیات تسلیم کیا مگر اُس کی سادگی۔ سہولت اور خلوص کو قائم نہ رکھا پیچیدہ رسمیں۔ مشکل ریاضتیں اور عجیب و غریب بدعات خود اپنی طرف سے گھڑ کر انہیں دین کا اہم جزو قرار دیا اور یوں

بالفعل یہ ظاہر کیا کہ اسلام جو رسولؐ اور اُس کے اصحاب نے پیش کیا وہ مکمل نہ تھا بلکہ ابھی اُس میں بہت سی باتوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے بس مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے اصولوں سے انحراف زہر قاتل ثابت ہوا اور ہونا تھا اس طرح مسلمانوں میں خود دو گروہ پیدا ہو کر حق و باطل کی طرح ٹکرانے لگے۔

کاش کہ مسلمان قرآنی تعلیمات کو فراموش نہ کرتے اور اسلام کو اس کی خالص شکل میں رکھتے اور فرمانِ نبویؐ کو قول فیصل جانتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ بفحوائے الفاظ قرآنی "اگر کسی بات میں تمہارا جھگڑا ہو جائے پس اُس کو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف لوٹاؤ یعنی وہاں سے راہ نمائی حاصل کرو"

ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ تکمیل دین کی آیت کے نزول کے وقت اور خلفائے راشدین کے مبارک ادوار میں صحابہ کرامؓ کی قبریں کچی تھیں نہ اُن کو غسل دیا جاتا تھا نہ اُن پر غلاف چڑھائے جاتے تھے نہ وہاں پیسے ڈالنے کے لئے صندوق ہوتے تھے نہ وہاں روشنی کی جاتی تھی۔ نہ اُن پر گنبد بنائے جاتے تھے۔ نہ درگاہیں تعمیر ہوتی تھیں۔ نہ متولی بیٹھتے تھے نہ عرس ہوتے تھے نہ میلے۔ البتہ قبروں پر جا کر اپنی موت کو یاد کرنا اور فوت شدوں کے حق میں دُعائے مغفرت کرنا معمول تھا۔ خود آنحضرتؐ قبرستان میں تشریف لے جاتے اور مردوں کے حق میں دُعائے مغفرت فرماتے مگر حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ منع فرمایا ہے رسول اللہؐ نے قبروں کو پختہ کرنے سے۔ ان پر عمارت بنانے سے اور ان پر بیٹھنے سے نیز آپؐ نے فرمایا "اللہ کی لعنت ہے قبروں پر چراغ جلانے والوں پر" آپؐ کے ان فرامین پر عہد نبوی میں عمل رہا اور خلافت راشدہ میں بھی قبروں پر گنبد تعمیر نہ کئے گئے یہی چیز کتب تواریخ سے ثابت ہے۔ اب مسلمانوں کا عمل ملاحظہ ہو کہ آنحضرتؐ کے اسوہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ کے خلاف قبریں پختہ بن رہی ہیں ان پر گنبد بنائے جا رہے ہیں۔ درگاہیں تعمیر ہو رہی ہیں متولی بیٹھے ہیں۔ عرس اور میلے ہو رہے ہیں۔ قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے۔ غلاف چڑھائے جا رہے ہیں اور وہاں منتیں مانی جا رہی ہیں۔

یہ ایک مثال ہے علاوہ ازیں بدعات کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں شامل ہے اور سنت رسولؐ کے متوازی ایک دوسرا سلسلہ

قائم ہے۔ بچے کی پیدائش کی رسومات، وفات پر مختلف ناموں پر اجتماع۔ نکاح کے موقعہ پر فضول رسمیں اور اُسوہ حسنہ کی خلاف ورزی۔ شب برات۔ معراج شریف اور لیلۃ القدر کے خود ساختہ پروگرام۔ میلاد النبیؐ کے نام پر عید۔ الغرض اسلام کو مکمل ضابطہ حیات قرار دینے والے خود نئی نئی چیزیں دین میں شامل کر رہے ہیں اور علمائے حق کا وہ گروہ جو اُن کی اِن بدعات کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور دین کو اُسوۂ رسولؐ اور عمل صحابہ کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے اُسے بُرا بھلا کہتے ہیں حالانکہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے ہمارے اس دین میں ایسی کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے بس وہ مردود ہے۔ نیز "سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ حضرت محمدؐ کا طریقہ ہے اور بدترین چیز وہ ہے جو دین میں نئی پیدا کی گئی ہو اور ہر بدعت گمراہی ہے" بدعت کو آپؐ نے اس لئے بدترین عمل قرار دیا کہ دین میں اضافہ جائز سمجھنے والا دراصل تکمیل دین کی نفی کر رہا ہے وہ اپنے ناقص ذہن کیساتھ دین کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ ربّ العزت اُسے مکمل کر چکا ہے۔ بظاہر بدعات کو مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے مگر یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ اس سے دین کی سادگی اور سہولت پر زد پڑتی ہے اور دین میں سادگی اور سہولت منشائے خداوندی ہے" اللہ تعالےٰ ارادہ کرتا ہے تمہارے لئے آسانی اور نہیں چاہتا تمہارے لئے تنگی۔

دین میں بدعات کے وجود کو صحیح تسلیم کرنے والے کہتے ہیں کہ ان چیزوں سے ہمارا مقصود قربِ الٰہی کا حصول ہے یعنی ہماری نیت نیک ہے۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قربِ الٰہی کے حصول کے جو طریقے مناسب اور بھلے تھے وہ خود آنحضرتؐ نے سکھلا دیئے ہیں اور کسی دوسرے کے لئے اس میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

قرآن پاک میں بدعت کی مذمت سورۃ الحدید میں مذکور ہے۔ رہبانیت اسلام میں نہیں ہے۔ لیکن نصاریٰ نے دنیا کی شہوات اور لذائذ سے کنارہ کشی کرنے کیلئے حسنِ نیت پر ترکِ دنیا اختیار کیا۔ اس طرح وہ گناہ سے بچنے کا اہتمام کرنے لگے۔ گناہ سے بچنے کا یہ اہتمام چونکہ فطرت کے تقاضوں سے متصادم تھا لہٰذا وہ لوگ اس پر قائم نہ رہ سکے اور اپنی حسنِ نیت کے باوجود غضبِ الٰہی کے سزاوار ہوتے۔ بفحوائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِسلام اور حقوق اطفال

از قلم:۔ غازی عزیر (علی گڑھ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِی اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ط

اَمَّا بعد - سالِ گذشتہ (۱۹۷۹ء) تقریباً تمام عالم ارضی[1] پر بچوں کا بین الاقوامی سال بڑے زور و شور سے منایا گیا۔ اس موقعہ پر حقوقِ اطفال سے متعلق جگہ جگہ کھیل کود، نمائش، تہوار، تحریری و تقریری مقابلوں اور ورایٹی شو پروگرام کا اہتمام کیا گیا، بڑے بڑے فنڈ قائم کئے گئے، ضخیم کتب چھپیں اور فلمیں تیار ہوئیں، مختلف اصحابِ فکر و دانش نے علوم نفسیات و حیاتیات و عمرانیات و دیگر علوم جدیدہ و فنون لطیفہ کی روشنی میں طول طویل

---

[1] جن ممالک میں بچوں کا بین الاقوامی سال منایا گیا اُن کی کل تعداد ایک سو باسٹھ ہے (انگریزی مجلہ "ٹائم" مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۹ء ج ۱۱۴ شمارہ ۱۱ ص ۱۷)

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "شبہات حول الاسلام" محمد قطب و "اسلام کا نظامِ حیات" سید مودودی۔

مقالات بھی لکھے لیکن دینی و مذہبی حلقوں سے جو مقالات پیش کئے گئے وہ نہ صرف ناکافی بلکہ بیحد تشنہ و خانہ پُری کی حد تک تھے۔ حالانکہ اسلام ایک ایسا نظام اور دین ہے جو انسان کے عالم وجود میں آنے سے قبل تا وفات و حیات اُخروی کے جملہ متعلقات سے مفصل بحث کرتا ہے۔ اسلام محض رُوحانی عقائد اور چند بدنی و مالی عبادات کے مجموعہ کا نام ہرگز نہیں[1] بلکہ یہ ایک ایسا ہمہ گیر، جامع، فطری و عملی اسلوب حیات ہے جس میں وہ اعتقادی تصور بھی شامل ہے جس سے کائنات کی ماہیت واضح اور اس میں انسان کا مرتبہ و مقام، اس کا طرز زندگی، اس کے فرائض و حقوق، اور اس کے وجود کی غرض و غایت متعین ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ اسلوب زندگی مربوط طور پر ان اقدار پر مشتمل ہے جو حیات بشری کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرنے والی اقدار، انسان کی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے والی اقدار، انسان کی مختلف سرگرمیوں کی نگرانی اور اُن کے حقوق کی حفاظت کرنے والی اقدار کہلاتی ہیں۔ اس اسلوبِ حیات کا امتیازی نشان یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں لوگ بہت سے معبودوں اور مختلف ارباب کی بندگی چھوڑ کر صرف ایک معبود کی بندگی کرتے ہیں اور الوہیت و ربوبیت و حاکمیت کی صفات میں صرف اُسی سے ہی اپنے تصورات و اقدار، معیارات، حقوق، نظامات، قوانین، اخلاق و آداب حاصل کرتے ہیں[2]۔ چنانچہ اس مقالہ میں ہم بھی حقوق اطفال کا مطالعہ نصوص الکتاب و سنت الحافلہ کی روشنی میں کرنے کی کوشش کریں گے۔ و باللہ التوفیق۔

دورِ جاہلیت میں حقوقِ اطفال

اسلام نے اطفال کو کیا مراعات اور خصوصی حقوق عطا کئے ہیں جو اس سے قبل اُن کو حاصل نہ تھے؟ اس سوال کے جواب کے لئے ناگزیر ہے کہ ہم دورِ جاہلیت میں حقوقِ اطفال کا جائزہ لیں بعد ازاں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں۔

اسلام سے قبل حقوقِ اطفال کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ بچوں کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے، معاشرہ میں اُن کی کوئی حیثیت نہ تھی، اُن کو قابل توجہ نہ سمجھا

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "المستقبل لھذا الدین" سید قطب شہیدؒ اردو ترجمہ از عبدالحمید صدیقی ص ۲۶، ۲۷ مطبوعہ مغربی جرمنی

جاتا تھا، سوسائیٹی کے وہ حقیر ترین جزو سمجھے جاتے تھے، اُن کی اپنی زندگی محفوظ نہ تھی، مشرکین عرب اولاد کی پرورش کو اپنے لئے بوجھ تصوّر کرتے تھے اور اس باعث اکثر و بیشتر اُن کو افلاس کے خدشہ سے قتل کر دیا کرتے تھے، لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے چنانچہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی قبیح و انسانیت سوز رسم عام تھی۔ لڑکیوں کو باعث ننگ و عار سمجھنے اور اُن کو زندہ دفن کر دینے کا ذکر قرآن کریم میں خدا تعالےٰ اس طرح فرماتا ہے:۔

لے مشرکین عرب ایک طرف تو لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے اور دوسری طرف جنوں، فرشتوں اور لڑکیوں کو اللہ کی بیٹیاں تصوّر کرتے تھے۔ خدا تعالےٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:۔

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰکُمْ بِالْبَنِیْنَ ۔ (الزخرف - ۱۶)	"ترجمہ: کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لئے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟"
(۲) وَیَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَہٗ ۙ وَلَہُمْ مَّا یَشْتَہُوْنَ ۝ (النحل - ۵۷)	"ترجمہ: یہ خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں سبحان اللہ ان کے لئے وہ ہے جو یہ خود چاہیں یعنی لڑکے"
(۳) اَمْ لَہُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْہِ ۚ فَلْیَاْتِ مُسْتَمِعُہُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۭ اَمْ لَہُ الْبَنٰتُ وَلَکُمُ الْبَنُوْنَ ۭ (الطور - ۳۸ و ۳۹)	"ترجمہ: کیا اُن کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی سُن گُن لیتے ہیں؟ ان میں سے جس نے سُن گُن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل کیا اللہ کے لئے تو ہیں بیٹیاں اور تم لوگوں کے لئے ہیں بیٹے؟"
(۴) اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی ۝ تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی ۝ اِنْ ہِیَ اِلَّآ اَسْمَاۗءٌ سَمَّیْتُمُوْہَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِہَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ (النجم، ۲۱ تا ۲۳)	"ترجمہ: کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کیلئے کوئی سند نازل نہیں کی"

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا

"ترجمہ: اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے

(حاشیہ صـ۳)

(۵) إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثَىٰ ۝ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ (النجم - ۲۷ و ۲۸)

"ترجمہ: مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں - حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے - وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا -"

(۶) وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝

(الصّٰفّٰت - ۱۵۸)

"ترجمہ: انہوں نے اللہ اور فرشتوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے حالانکہ فرشتے خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ (مجرموں کی حیثیت سے) پیش کئے جانے والے ہیں -"

(۸) وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةٌ ۖ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ

(الانعام ۱۰۰، ۱۰۱)

"ترجمہ: اور لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا حالانکہ وہ ان کا خالق ہے اور انہوں نے بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹیاں اور بیٹے گھڑ لیں حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے ان باتوں سے جو وہ کہتے ہیں - وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اسکی شریک زندگی ہی نہیں ہے - اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے -"

(۸) أَنَّهُ تَعَالَىٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ۝ (الجن - ۳)

"ترجمہ: - اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ وارفع ہے - اس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا"

(۹) لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝

(الاخلاص - ۳)

"ترجمہ: نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے -"

ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ — رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں
هُوَ كَظِيْمٌ (الزخرف - ۱۷) — (یعنی لڑکی) اُس کی ولادت کا مژدہ
جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اُس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔"

اور

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى — "ترجمہ:- جب ان میں سے کسی کو
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ — بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی
كَظِيْمٌ ۝ يَتَوٰرٰى مِنَ — جاتی ہے تو اُس کے چہرے پر کلونس
الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ — چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا
بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ — سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔
اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ — لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس
(النحل - ۵۸، ۵۹) — بُری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔
سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دے۔"

ہشیم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا۔ ایک اس پر عمل کرتا تھا، دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک اسلام نہیں آیا تھا۔ (میدانی)

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عہد جاہلیت میں اپنی لڑکی کو زندہ دفن کرنے کا بیحد رقت انگیز واقعہ سنایا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے کافی مانوس تھی۔ جب میں اس کو پکارتا تھا تو وہ دوڑی ہوئی میرے پاس آتی تھی۔ ایک دن میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستہ میں ایک کنواں ملا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنویں میں دھکیل دیا۔ آخری آواز جو اُس کی میرے کانوں میں پڑی وہ تھی "ہائے ابا، ہائے ابا"۔ یہ واقعہ سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رو دیئے اور آپ کے اشک مبارک بہہ نکلے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا اے شخص! تو نے حضورؐ کو رنجیدہ کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا: اسے مت روکو۔ جس چیز کا اسے سخت احساس ہے اُس کے متعلق اسے سوال کرنے دو۔ پھر آپؐ

نے اس سے فرمایا: اپنا قصّہ دوبارہ بیان کرو۔ اُس نے دوبارہ اس واقعہ کو بیان کیا۔ آپؐ سن کر اس قدر روئے کہ آپؐ کی داڑھی آنسوؤں سے نم ہوگئی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: جاہلیت میں جو کچھ ہوگیا اللہ نے اُسے معاف کردیا، اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرو۔ (سنن الدارمی ج ۱ باب اوّل)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مرحوم) بیان کرتے ہیں کہ "عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اُسی وقت اُسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے۔ اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی یا اس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادلِ ناخواستہ اُسے کچھ مدّت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جاکر زندہ دفن کردیتا۔" (تفہیم القرآن ج ۶ ص ۲۶۵)

سُنن الدارمی میں لکھا ہے کہ "بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہوجاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی، تو جاہلی باپ دھوکہ دے کر اُس کو لیجاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کرتا۔" (سُنن الدارمی ج ۱، باب ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلے اللہ علیہ وسلّم من الجہل والضلالۃ ص ۳)

اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے ہی اندوہناک اور رقت انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔

"بعض ننگ وعار کی بنا پر، بعض خرچ[1] ومفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے

---

[1] مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب دورِ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان فرماتے ہیں:۔ "ایک معاشی خستہ حالی جس کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پالنے پوسنے کا بار اُن پر نہ پڑے۔ بیٹوں کو تو اس اُمید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وہ حصُولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے۔ مگر بیٹیوں کو اس لئے ہلاک کردیا جاتا تھا کہ انہیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انہیں بیاہ دینا ہوگا۔ دوسرے عام بلامنی جس کی وجہ سے بیٹوں کو اس لئے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اُس کے اتنے ہی حامی ومددگار ہوں گے۔ مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کردیا جاتا تھا کہ قبائلی

(بقیہ حاشیہ ص ۸۷)

تھے ۔" (بلوغ الارب فی احوال العرب)

دورِ جاہلیت میں صرف لڑکیاں ہی زندہ درگور نہیں کی جاتی تھیں بلکہ اکثر لڑکوں کو بھی اہلِ عرب مفلسی کے خوف سے قتل کر دیا کرتے تھے ۔ چنانچہ مولانا ابوالحسن علی الحسینی الندوی صاحب لکھتے ہیں :" اس معاشرے کے عادات واطوار ہلاکت آفرین تھے جو دنیا کو ہلاکت کے غار میں دھکیل رہے تھے . . . . سنگدلی اور بے رحمی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں اور لڑکے بچپن میں قتل کر دیئے جاتے تھے ۔" (اردو ترجمہ " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین " ص ۱۴۳ مطبوعہ مغربی جرمنی)

اسی بابت " اہلِ عرب میں رائج قتل اولاد کی تین صورتیں " بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں :..... " بچوں (لڑکوں) کا قتل ، اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اٹھایا جاسکے گا اور ذرائع معاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابل برداشت بوجھ بن جائیں گے . . . . . الخ ۔" (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۵۸۶)

اہلِ عرب کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زمانۂ جاہلیت کی اس انتہائی غیر انسانی رسم کی قباحت کا شدید احساس تھا ۔ جیسا کہ اس عبارت سے پتہ چلتا ہے ۔" عرب کے بعض شرفاء ورؤساء ایسے موقع پر بچوں کو خرید لیتے تھے ۔ اور اُن کی جان بچاتے تھے ۔" (بلوغ الادب فی احوال العرب)

ایک اور روایت میں ہے کہ مشہور عربی شاعر فرزدق کے دادا صَعْصَعَہ بن ناجیتہ المجاشعی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا " یارسول اللہ ! میں نے

(بقیہ حاشیہ ص ۸۶) لڑائیوں میں اُلٹی اُن کی حفاظت کرنی پڑتی تھی ۔ اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آسکتی تھیں ۔ تیسرے عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تو جو لڑکیاں بھی اُن کے ہاتھ لگتی تھیں انہیں لے جا کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے ۔" (تفہیم القرآن ج ۶ ص ۲۶۵ حاشیہ ۹)

دورِ جاہلیت میں کچھ اچھے اعمال بھی کئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے ۳۶۰ لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچایا اور ہر لڑکی کی جان کے بدلے دو دو اونٹ فدیے میں دیئے۔ کیا مجھے اس کا اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں تیرے لئے اجر ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے اسلام کی نعمت عطا فرمائی ہے۔" (الاغانی لابی الفرج الاصفہانی ورواہ الطبرانی)

بیٹی کو زندہ دفن کرنے والے یا بیٹے کو قتل کرنے والے ماں باپ خدا تعالےٰ کی نگاہ میں اتنے قابلِ نفرت و غضبِ الٰہی کے باعث ہوں گے کہ روزِ قیامت اُن کو مخاطب کرکے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ اُن سے نگاہ پھیر کر اُس معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ "تو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی؟"[1] تو وہ اپنی داستانِ ظلم اس طرح بیان کرے گی کہ "ظالم ماں باپ نے اُس کے ساتھ ظلم کیا اور کس بے دردی سے اُس کو زندہ دفن کر دیا۔"

اسلام میں قتلِ اولاد کی ممانعت

خدا تعالےٰ نے اس جاہلی رسم پر جہاں سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے وہیں اس کو زبردست خطا و ناقابلِ معافی گناہ بتایا ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری ہے:-

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (الانعام - ۱۴۰)

"ترجمہ:- یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بناء پر قتل کیا۔"

اور

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ط اِنَّ

"ترجمہ: اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں

---

[1] وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر - ۸ و ۹) "ترجمہ: اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔"

قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا ۝	بھی۔ درحقیقت اُن کا قتل ایک
(بنی اسرائیل-۳۱)	بڑی خطا ہے۔"

ایک اور مقام پر فرمایا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ	"ترجمہ:- اے نبیؐ! جب تمہارے
الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى	پاس مومن عورتیں بیعت کرنے
اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا	کے لئے آئیں اور اس بات کا
..... وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَ	عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی
هُنَّ .... فَبَايِعْهُنَّ وَ	چیز کو شریک نہیں کریں گی....
اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ	اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی....
(الممتحنہ-۱۲)	تو اُن سے بیعت لے لو، اور اُن کے

حق میں اللہ تعالےٰ سے دُعائے مغفرت کرو۔"

کتب حدیث میں وارد ہوا ہے کہ فتح مکّہ کے بعد اہلِ قریش جوق در جوق حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ آپؐ نے مردوں سے کوہِ صفا پر خود بیعت لی اور حضرت عمر بن الخطابؓ کو عورتوں سے بیعت لینے اور ان تمام باتوں کا اقرار کرانے کے لئے، جو سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ میں بیان کی گئی ہیں، اپنی طرف سے مامور فرمایا۔" (ابن جریر بروایت ابن عباس، ابن ابی حاتم بروایت قتادہ)

ایک اور حدیث میں ہے کہ "مدینہ تشریف لے جانے کے بعد آپؐ نے ایک مکان میں انصار کی خواتین کو جمع کرنے کا حکم فرمایا اور وہاں بھی حضرت عمر بن الخطابؓ کو اُن خواتینِ انصار سے بیعت لینے کے لیے بھیجا۔" ابن جریر، ابن مردویہ، بزار، ابن حبان بروایت اُمّ عطیہ انصاریہ)

امام بخاری ابن عباس سے نقل فرماتے ہیں کہ "عید کے دن مردوں کے درمیان خطبہ دینے کے بعد آپ عورتوں کے مجمع کی جانب تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطبہ کے دوران آپ نے سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ تلاوت فرمائی اور اس آیت میں مذکورہ جملہ باتوں کا عہد لیا۔" (بخاری)

یہ اسلام کی برکتوں میں سے ایک بڑی برکت اور اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ اہلِ عرب سے اس انتہائی انسانیت سوز وسنگدلانہ رسم کا خاتمہ کیا بلکہ اس تخیل کو قطعی مٹا دیا کہ بیٹی کی پیدائش کوئی حادثہ ومصیبت وقلتِ معاش کا باعث ہے جسے بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جائے ۔ اس کے برعکس اسلام نے یہ تعلیم دی کہ بیٹیوں کی پرورش کرنا، انہیں عمدہ تعلیم وتربیت دینا، اور انہیں اس قابل بنانا کہ وہ ایک اچھی واطاعت گزار بیوی ونیک وصالح ماں بن سکیں بہت بڑا نیکی وثواب کا کام ہے ۔ لڑکیوں کی پرورش وتربیت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کافی ارشاد وفرمودات کتبِ احادیث میں مذکور ہوئے ہیں جن میں سے چند ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں :۔

(۱) من ابتلی من هذه البنات بشیءٍ فاحسن الیهن کن له ستراً من النار (بخاری ومسلم)

"ترجمہ :۔ جو شخص ان لڑکیوں کی پیدائش سے آزمائش میں ڈالا جائے اور پھر وہ ان سے نیک سلوک کرے تو یہ اس کیلئے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی ۔"

(۲) من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامة انا و هکذا و ضم اصابعه (مسلم)

"ترجمہ :۔ جس نے دو لڑکیوں کو پرورش کیا، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں تو قیامت کے روز میرے ساتھ وہ اس طرح آئے گا یہ فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر بتایا ۔"

(۳) من کانت له انثی فلم یئدها ولم یهنها ولم یؤثر ولده علیها ادخله الله الجنة ۔ (ابو داؤد)

"ترجمہ :۔ جس کے ہاں لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ دفن نہ کرے، نہ ذلیل کر کے رکھے نہ بیٹے کو اس پر ترجیح دے اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا ۔"

(۴) من کان له ثلاث بنات و صبر علیهن و کساهن

"ترجمہ :۔ جس کے ہاں تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان پر صبر کرے اور اپنی

من جِدَ تِهٖ كن له حجابًا
من النار (ابن ماجه، بخاری فی
الادب المفرد)

وُسعت کے مطابق اُن کو اچھے کپڑے
پہنائے وہ اس کے لئے جہنّم کی آگ سے
بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی ۔"

(۵) مامن مسلم تدرکه
ابنتان فيحسن صحبتهما
الا ادخلتاه الجنة
(بخاری، ادب المفرد)

"ترجمہ: جس مسلمان کے ہاں دوؔ بیٹیاں
ہوں اور وہ اُن کو اچھی طرح رکھے
وہ اُسے جنّت میں پہنچائیں گی ۔"

(٦) من عال ثلث بنات او
مثلهن من الاخوات
فادّبهن ورحمهن حتّٰى
يغنيهن الله اوجب الله
له الجنة ـ فقال رجل
يارسول الله او اثنتين ؟
قال او اثنتين حتّٰى لو قالوا
او واحدة لقال واحدة
(شرح السُّنّة)

"ترجمہ: جس شخص نے تینؔ بیٹیوں
یا بہنوں کو پرورش کیا، اُن کو اچھا
ادب سکھایا اور اُن سے شفقت
کا برتاؤ کیا یہاں تک کہ وہ اُس کی
مدد کی محتاج نہ رہیں تو اللہ اُس
کے لئے جنّت واجب کردے گا۔
ایک شخص نے عرض کیا یارسُولؐ اللہ
اور دوؔ ؟ حضورؐ نے فرمایا: اور
دوؔ بھی (حدیث کے راوی ابن عباسؓ
کہتے ہیں کہ اگر لوگ اس وقت ایکؔ کے متعلق پوچھتے تو حضورؐ اس کے بارے
میں بھی یہی فرماتے)۔"

(۷) ان النبی صلے الله علیہ وسلم
قال لسُراقة بن جعشم
الا ادلك على اعظم الصدقة
او من اعظم الصدقة
قال بلى يارسُول الله قال
ابنتك المردودة اليك
ليس لها كاسب غيرك

"ترجمہ: ۔ نبی صلّی اللہ علیہ وسلم نے سُراقہ
بن جعشم سے فرمایا: میں تمہیں بتاؤں
کہ سب سے بڑا صدقہ (یا فرمایا بڑے
صدقوں میں سے ایک) کیا ہے ؟
انہوں نے عرض کیا: ضرور بتایئے
یارسُول اللہ ۔ فرمایا: تیری وہ بیٹی
جو (طلاق پاکر یا بیوہ ہوکر) تیری طرف

(ابن ماجہ، بخاری فی الادب المفرد) پلٹ آئے اور تیرے سوا کوئی اس کے لئے کمانے والا نہ ہو۔"

ایک طرف اسلام نے لڑکیوں کی زندگی کو تحفظ بخشا، معاشرہ میں انہیں اچھا مقام دیا، اُن کے سرپرستوں کے لئے اُن کی پرورش کو جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنایا تو دوسری طرف لڑکوں کو بھی کسی طرح پیچھے نہیں چھوڑا۔ قرآن کریم میں لڑکوں کے متعلق فرمایا گیا ہے:۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (الکہف - ۴۶)

"ترجمہ: مال اور لڑکے اس دنیاوی زندگی کی زینت ہیں۔"

حقوق الجنین والحاملہ

خاندان کے ادارے کو محفوظ و مستحکم بنانے کے لئے اسلام "جنین" اور "حاملہ" کے مخصوص حقوق کا تعاون بھی کراتا ہے اور اُن کے تحفظ و بقاء کی سخت تاکید کرتا ہے۔ ضبط ولادت، نسل کشی، اسقاط حمل اور تمام مانع حمل تدابیر کو قطعاً حرام و ناجائز قرار دیتا ہے۔ اسقاط حمل کو "قتل بیجا" کے مترادف قرار دیتا ہے اور کسی فرد کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی پیدا ہونے والی معصوم زندگی کو اس کے حق سے محروم کرے یا جو کچھ رحم مادر میں قانونِ قدرت سے استقرار پا چکا ہے اس کو نکال باہر کرے۔ قتلِ اولاد کو خدا تعالےٰ مشرکانہ و گمراہ کُن فعل قرار دیتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ط (الانعام - ۱۳۷)

"ترجمہ: اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں۔ اور ان پر اُن کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔"

سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۰ اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۳۱ میں خدا تعالےٰ نے واضح الفاظ میں ان تمام معاشی بنیادوں کو منہدم کر دیا ہے جن پر زمانہ قدیم سے

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تاحال ضبط ولادت و تحدید نسل کی مختلف جماعتی و سرکاری تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں یہی افلاس کا خوف قتل اولاد و تدفین بنات کا محرک ہوا کرتا تھا آج یہی خوف نسل کشی کی مختلف اشکال مثلاً اسقاط حمل و مانع حمل تدابیر اپنانے پر دنیا کو مجبور کر رہا ہے۔ اسلام کا یہ منشور عالم انسانی کو کھلی دعوت پیش کرتا ہے کہ وہ کھانے والوں کی تعداد گھٹانے کی مہلک و تخریبی کاروائی ترک کر دیں اور اس کے بجائے اپنی علمی و دینی و جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ان تعمیری مقاصد میں صرف کریں جن سے قانونِ فطرت رزق میں وسعت و کشادگی بخشتا ہے۔

خدا تعالےٰ قلتِ رزق کے خوف یا دوسرے معاشی ذرائع کی قلت کے باعث افزائش نسل کا سلسلہ منقطع کر دینے کی جملہ مساعی کو انسان کی عظیم ترین خطا قرار دیتا ہے اور کھلے الفاظ میں متنبہ کرتا ہے کہ رزق رسانی کا نظم انسانوں کے قبضۂ قدرت میں نہیں بلکہ فقط میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ جس طرح پہلے گزرنے والی نسلوں کو رزق عطا فرماتا رہا ہے اسی طرح موجودہ و بعد کی آنے والی نسلوں کو بھی روزی عطا فرماتا رہے گا۔ تاریخ عالم کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے کہ جوں جوں انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا یوں یوں معاشی وسائل بھی وسیع تر ہوتے چلے گئے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کے تخلیقی نظام میں انسان کی بے جا مداخلت و رخنہ اندازی سوائے اُس کی کج عقلی و

(حاشیہ صفحہ ۱۲ کا)

لہ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ (الانعام - ۱۴۰)

"ترجمہ: یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا۔"

لہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ط اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝

(بنی اسرائیل - ۳۱)

"ترجمہ: اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔"

حماقت کے کچھ نہیں۔ مجملاً شریعت اسلامیہ میں ضبطِ تولید کا سرے سے کوئی تصور نہیں ہے۔ علمائے اسلام متفقہ طور پر اس کو قطعاً ناجائز و حرام قرار دیتے ہیں۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ قتلِ اولاد، منعِ حمل اور اسقاطِ حمل کو کسی بھی شریعت یا کسی بھی مکتبِ فکر نے جائز نہیں رکھا ہے، خواہ وہ عیسائی مذہب ہو یا یہودی، اسلامی نظامِ حیات ہو یا اشتراکی نظریہ[2]۔ ذیل میں ہم ایک انگریزی ہفتہ وار کے حوالے سے مذہب عیسائی میں تحدیدِ نسل کے متعلق اُن کے شرعی احکامات و مذہبی نظریات پیش کر رہے ہیں، اگرچہ یہ سب کچھ اسلامی تعلیمات سے مستعار لئے ہوئے نظریات ہیں لیکن پھر بھی قابلِ قدر ہیں۔

جان پال دوم (JOHN PAUL - II) نے واشنگٹن کے اپنے حالیہ دورہ میں پونے دو لاکھ سامعین کے ایک جلسہ میں اسقاطِ حمل پر سخت تنقید کرتے ہوئے خطاب فرمایا: "..... ہم ہر وقت اسی نظریہ کے قائل و حامی رہے ہیں کہ انسانی زندگی خطرہ میں ہے۔ اگر پیدائش سے قبل ہی انسانی زندگی پر حملہ کیا جائے تو ہم اس نظریہ کے حامی

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "ضبطِ ولادت"، مولفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

[2] اس امر میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ اسقاطِ حمل کائنات و عالمِ انسانی کے ہر شعبۂ حیات میں ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ جسے کوئی آفاقی یا انسانی نظریہ برداشت نہیں کر سکتا الّا یہ کہ وہ اپنی سطح سے فروتر ہو جائے۔ چنانچہ اشتراکی نظامِ حکومت بھی اسقاطِ حمل کو قانونی جرم قرار دینے پر مجبور ہو گیا۔ نہ صرف یہی بلکہ بچوں کی تعداد بڑھنے پر ماں کو اعزاز دیا جانے لگا۔ جناب خورشید احمد صاحب ایک مقام پر اشتراکیت میں اسقاطِ حمل کی قانونی ممانعت لکھنے کے بعد اپنے وضاحتی نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں: "اسقاط کا قانون روس کی تاریخ میں وہ واحد قانون ہے جس کے بارے میں عوامی مرضی معلوم کرنے کے لئے فیکٹریوں سے رجوع کیا گیا۔ استصوابِ رائے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن جب آنے والی آرا کی اکثریت حکومت کے مجوزہ قانون کے خلاف معلوم ہوئیں تو استصواب کو روک دیا گیا اور ۲۷ دسمبر ۱۹۳۶ء کو (اسقاطِ حمل کی) ممانعت کا قانون نافذ کر دیا گیا۔" (سوشلزم یا اسلام مؤلفہ خورشید احمد ص ۱۱۶ حاشیہ ۳ مطبوعہ مغربی جرمنی)

وداعی ہیں کہ کسی فرد کو غیر مولود زندگی تباہ کرنے کا قطعی حق، و اختیار نہیں ہے۔" (انگریزی ہفتہ وار "ٹائم" ج ۱۱۴ شمارہ ۱۷ ص۴۷ و ص۴۸)

"فلیڈ یلفیا اور شکاگو میں بھی جان پال دوم نے تجدید ولادت کی تمام غیر فطری تدابیر کے خلاف سخت الفاظ میں تنقید کی۔" (ایضاً)

مشہور انگریزی ہفتہ وار "ٹائم" لکھتا ہے کہ "درحقیقت تا حال صفِ اوّل کے پروٹسٹینٹ، مشرقی قدامت پسند، یہودی اور مسلم علماء میں سے کسی نے بھی سنجیدگی کے ساتھ مکمل اور آزادانہ اسقاطِ حمل کی اجازت نہیں دی ہے۔ الا یہ کہ ناگزیر و غیر معمولی حالات درپیش ہوں (مثال کے طور پر اگر ماں کی زندگی خطرہ میں ہو تو ایسی صورت میں اسقاط کی گنجائش ہے)۔ (ایضاً ص۴۸ و ص۴۹)

کلیسا کی طرف سے اسقاطِ حمل کی مخالفت ایک مذہبی کتاب (CIRCA 100 AD) DIDACHE، جس نے اسقاطِ حمل کو "قتل" قرار دیا ہے، سے شروع ہوئی۔ اس نظریہ کے اندر صدیوں میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ویٹیکن کونسل دوم SECOND VATICAN COUNCIL (روم کی وہ جگہ جہاں پوپ رہتا ہے) نے اسقاطِ حمل کے بارے میں اسی نظریہ کی تجدید و تائید کی اور اس کو "ناگفتہ بہ جرم" قرار دیا.... جان پال اس کا تعلق انسان کے ایسے بنیادی حقوق کے استحصال کے ساتھ جوڑتا ہے جو قطع صلۂ رحمی کے مترادف ہیں۔" (ایضاً)

جان پال کے نزدیک انسان کے بنیادی حقوق کے تحفظ کا اقدام لازمی ہے۔ اس نے کہا کہ "اگر کسی شخص کے زندہ رہنے کے حق کو اس لمحہ چھینا جاتا ہے جب کہ وہ رحم مادر میں پہلی بار استقرارِ حمل کی صورت اختیار کرتا ہے تو بطریق دیگر یہ تمام اخلاقی اقدار پر ایک زبردست گھونسہ مارنا ہے۔" (ایضاً)

کلیسا کی "تجدید ولادت" کے خلاف نفرت ان کی مذہبی تعلیمات کے عین مطابق ہے جس میں لکھا ہے کہ "زرخیز بنو اور افزائش نسل کرو۔" (عہد نامہ قدیم)

۱۹۳۰ء میں اینگلیکن چرچ (ANGLICAN CHURCH) کی پاپائی تنظیم نے اپنی لیمبیتھ کانفرنس (LAMBETH CONFERENCE) میں انتہائی ناپسندیدگی کیساتھ "تجدید ولادت" کو منظور کیا تھا مگر اس فیصلہ کی تردید و مخالفت میں پوپ پائیس

POPE PIUS (۱۹۳۹-۱۹۲۲ء) نے CASTI CONUBii (پُرلطف ازدواجی بندش) نامی ایک خط برائے تشہیر جاری کیا اور اُس میں نہایت فیصلہ کن طریقے پر بیان کیا کہ "مرد و زن کے درمیان ازدواجی تعلقات کا بنیادی مقصد افزائش اولاد ہے۔ وہ افراد جو بحالت تذبذب ایسا کر کے قانونِ فطرت میں افراط و تفریط پیدا کرتے ہیں اُن کا مقصد فطرت کے مخالف گناہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ ایسے فعل کا ارتکاب کرتے ہیں جو باعث شرم و حد درجہ بُرا اور نفرت انگیز ہے۔" (ایضاً)

پوپ پائیس کے جانشین پائیس دوازدھم XII - PIUS (۱۹۵۸-۱۹۳۹ء) نے کہا کہ "طبّی، معاشی، معاشرتی و طبیعی محرکات شادی شدہ جوڑوں کو اپنے خاندان مختصر و محدود رکھنے کے قابل قبول جواز ہیں۔" (ایضاً)

پوپ جان بست وسہ XXIII - POPE JOHN نے اس معاملہ کی تحقیق کے لئے ایک مخصوص کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن کی خفیہ رپورٹ، جو بعد میں خفیہ نہ رہی تھیں، نے ۱۹۶۶ء میں پال ششم VI - PAUL کو "خود غرض مقاصد کے لئے بچوں سے بچنے کے خلاف متنبہ کیا۔" (ایضاً)

پائیس دوازدہم XII - PIUS کے اقتدار کے بعد رپورٹ "تعلیم یافتہ انسان اور سائنس" کے درمیان تعاون و تطبیق کی دعوت دی تاکہ "تحدید نسل کے عمدہ انسانی وسائل" دریافت ہو سکیں۔ اخلاق و اقدار بچے، ماں باپ اور خاندان کی فلاح پر منحصر ہیں نہ کہ کسی خصوصی عمل کے ذریعہ زرخیز ہونے پر۔" (ایضاً)

لیکن ۱۹۶۸ء میں پال کے پیغام HUMANAE VITAE (انسانی زندگی) نے اس نظریہ کو قطعاً رد کر دیا اور واضح کیا کہ تحدید نسل کے جملہ غیر فطری وسائل ناقابل قبول ہیں ..... الخ" (ایضاً)

پال نے ازدواجی تعلقات کے دوران یا اس سے قبل یا اس کے بعد کسی ایسے طریقہ کو استعمال کرنا، جو ولادت کو ناممکن بنا دے، خلاف قانون گردانا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ غیر فطری وسائل کا کثیر استعمال جنسی اقدار کے پست معیار کو فروغ دے گا۔ جان پال دوم تحدید نسل کے خلاف یہاں بیان کردہ وجوہ کے متعلق کچھ مختلف نظریہ کے قائل ہیں ..... الخ" (ایضاً)

اسلام جہاں جنین کی سلامتی وحفاظت کی تعلیم دیتا ہے وہیں رحم مادر میں اس کی صحیح پرورش و بہتر نشوونما کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ عورت کے مرضع یا حاملہ ہونے کی صورت میں اگر روزہ جیسی فرض عبادت ماں و بچہ کی صحت کے لئے مضر ثابت ہوتی ہو تو اس کا قضا کرنا درست ہے، اسی طرح وضع حمل کے دوران نماز و روزہ جیسی اہم عبادات بھی قضا کرنا شرعاً درست و جائز ہے۔ اسلام ازدواجی زندگی کے غیر معمولی حالات یعنی طلاق و عدت کے دوران بھی حاملہ و حمل کے حقوق کو نظر انداز نہیں کرتا تاکہ شوہر و بیوی کے آپسی اختلافات کے باعث جنین کے حقوق متاثر نہ ہو سکیں، بلکہ اُن کے لئے خصوصی احکامات بیان کرتا ہے۔

اسلام کا قرینہ ملاحظہ فرمایئے کہ ایک طرف تو حاملہ عورت کی عدت[1] کے متعلق خصوصی قوانین کی نشاندھی کرتا ہے اور دوسری طرف اگر مطلقہ عورت حاملہ ہو تو خواہ اُسے رجعی طلاق دی گئی ہو یا قطعی طور پر الگ کر دینے والی بہرحال اُس کے وضع حمل تک اُس

---

[1] قرآن کریم میں خدا تعالےٰ فرماتا ہے،

مَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ ۔ "تمہارے لئے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے۔"

(الاحزاب - ۴۹)

اس آیت کی تفسیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب یوں بیان فرماتے ہیں: (یہ) الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ عورت پر مرد کا حق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ صرف مرد ہی کا حق ہے۔ دراصل اس میں دو حق اور بھی شامل ہیں۔ ایک حق اولاد، دوسرے حق اللہ یا حق الشرع۔ مرد کا حق وہ اس بنا پر ہے کہ اس دوران میں اس کو رجوع کر لینے کا حق ہے۔ نیز اس بنا پر کہ اس کی اولاد کے نسب کا ثبوت اس بات پر منحصر ہے کہ عدت کے زمانہ میں عورت کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہو جائے۔ اولاد کا حق اس میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے باپ سے بچے کا نسب کا ثابت ہونا اس کے قانونی حقوق قائم ہونے کے لئے ضروری ہے اور اس کے اخلاقی مرتبہ کا انحصار بھی اس امر پر ہے کہ اس کا نسب مشتبہ نہ ہو۔ پھر اس میں حق اللہ (یا حق الشرع) اس لئے شامل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کی پرواہ نہ بھی ہو تو خدا کی شریعت ان حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے ... الخ۔" (تفہیم القرآن

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی سکونت اور اُس کے نفقہ کا ذمہ دار شوہر کو قرار دیتا ہے کہ حاملہ عورت کی عدت یہ ہے کہ اس کا وضع حمل ہو جائے [۱] امام ابو بکر جصاص اسلام کی اس باریک بینی و حکمت عملی پر

(حاشیہ ص۱۷) ج ۲ ص۱۱۰-۱۱۱ حاشیہ ۸۶ شق ۲) ۔ عدت کے اس حق کو ادا کرنے کا طریقہ قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے ۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (البقرۃ - ۲۳۴)

" ترجمہ : تم میں سے جو لوگ مر جائیں ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں ۔ پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں اختیار ہے اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں "

[۱] قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ (الطلاق - ۴)

" ترجمہ :۔ اور حاملہ عورتوں کی عدیہ ہے کہ اُن کا وضع حمل ہو جائے "

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۴ ، اور سورۃ الطلاق کی آیت ۴ سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ حاملہ مطلقہ کی عدت تو وضع حمل تک ہی ہے مگر بیوہ حاملہ کی عدت اٰخر الاجلین ہے ۔ یعنی مطلقہ کی عدت اور حاملہ کی عدت میں سے جو زیادہ طویل ہو وہی اس کی عدت ہے ۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ سورۃ الطلاق کی یہ آیت سورۃ البقرہ کی آیت کے بعد نازل ہوئی ہے اس کے بعد کے حکم نے پہلی آیت کے حکم کو غیر حاملہ بیوہ کے لئے خاص کر دیا ہے ۔ اور ہر حاملہ کی عدت وضع حمل تک مقرر کر دی ہے خواہ وہ مطلقہ ہو یا بیوہ ۔ اس مسلک کی تائید حضرت اُبی بن کعب کی یہ روایت کرتی ہے : وہ فرماتے ہیں جب سورہ طلاق کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ مطلقہ اور بیوہ دونوں کے لئے ہے ؟ حضورؐ نے جواب دیا : ہاں ۔ ایک دوسری روایت میں حضورؐ نے مزید تصریح فرمائی ہے :۔" اجل کل حامل ان تضع ما فی بطنها یعنی ہر حاملہ عورت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مفصّل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں " حاملہ مطلقہ خواہ رجعیہ ہو یا مبتوتہ اس کی سکونت اور

(بقیہ حاشیہ ص۱۸) کی عدّت کی مدّت اس کے وضع حمل تک ہے " (ابن جریر و ابن ابی حاتم)
حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اگرچہ اس روایت کی سند میں کلام کی گنجائش ہے لیکن چونکہ یہ متعدد اسناد
سے منقول ہے اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کی کوئی اصل ضرور ہے) - اسکی تائید ایک اور واقعہ
سے ہوتی ہے سبیعہ اسلمیہ عہد نبوی میں بحالت حمل بیوہ ہوئی تھیں اور شوہر کی وفات کے چند
روز بعد (بعض روایات میں ۲۰ دن بعض میں ۲۳ دن، بعض میں ۲۵ دن، بعض میں ۴۰ دن
اور بعض میں ۳۵ دن بیان ہوئے ہیں) اُن کو وضع حمل ہوگیا تھا۔ حضورؐ سے اُن کے معاملہ میں
فتویٰ پوچھا گیا تو آپ نے ان کو نکاح کی اجازت دے دی (بخاری ومسلم نے اسے بروایت حضرت
اُم سلمہ کئی طریقوں سے نقل کیا ہے - اسی واقعہ کو بخاری، مسلم، امام احمدؒ، ابوداؤد، نسائی و
ابن ماجہ نے مختلف اسناد کے ساتھ حضرت مسور بن مخرمہ سے بھی روایت کیا ہے - خود سبیعہ
اسلمیہ کا بیان ہے کہ: میں حضرت سعد بن خولہ کی بیوی تھی، حجۃ الوداع کے زمانے میں میرے
شوہر کا انتقال ہوگیا جب کہ میں حاملہ تھی - وفات کے چند روز بعد میرے ہاں بچہ پیدا ہوگیا۔
ایک صاحب نے کہا کہ تم چار مہینے دس دن سے پہلے نکاح نہیں کرسکتیں - میں نے جاکر رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فتویٰ دیا کہ تم وضع حمل ہوتے ہی حلال ہوچکی ہو - اب
چاہو تو دوسرا نکاح کرسکتی ہو - (مسلم، اس روایت کو بخاری نے بھی باختصار نقل کیا ہے)
صحابہ کی کثیر تعداد سے یہی مسلک منقول ہے - امام مالکؒ، امام شافعیؒ، عبدالرزاق، ابن
ابی شیبہ اور ابن المنذر نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمر سے حاملہ بیوہ کا مسئلہ
پوچھا گیا تو انہوں نے کہا اس کی عدت وضع حمل تک ہے - اس پر انصار میں سے ایک صاحب
بولے کہ حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر شوہر ابھی دفن بھی نہ ہوا ہو بلکہ اسکی لاش اس کے
بستر پر ہی ہو اور اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہوجائے تو وہ دوسرے نکاح کے لئے حلال ہوجائے گی۔
یہی رائے حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابومسعودؓ بدری اور حضرت عائشہؓ کی ہے - اور اسی کو
أئمہ اربعہ اور دوسرے اکابر فقہاء نے اختیار کیا ہے - شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر حاملہ کے پیٹ
میں ایک سے زیادہ بچے ہوں تو آخری بچے کی ولادت پر عدت ختم ہوگی - بچہ خواہ مردہ ہی پیدا ہو
اس کی ولادت سے عدت ختم ہوجائے گی - اسقاط حمل کی صورت میں اگر دائیاں اپنے فن کی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اُس کا نفقہ شوہر پر واجب ہے اور غیر حاملہ رجعیہ کے لئے بھی یہ دونوں حقوق واجب ہیں۔" (احکام القرآن للجصاص)

قرآن کریم میں خدا تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے :۔

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ج — "ترجمہ :۔ اور اگر مطلقہ حاملہ ہو تو اس کے وضع حمل تک نفقہ ادا کرو"

(الطلاق ۔ ٦)

حقوق الجنین والحاملہ میں سے یہ امر متفق علیہ ہے کہ مطلقہ خواہ رجعیہ ہو یا مبتوتہ اگر حاملہ ہے تو وضع حمل تک اُس کی سکونت اور اُس کے نفقہ کا ذمہ دار شوہر ہے لیکن اگر حاملہ کا شوہر مرگیا ہو تو ایسے حالات میں فقہائے اسلام سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، قاضی شریح، ابوالعالیہ، شعبی، ابراہیم نخعی اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ شوہر کے مجموعی ترکہ میں اس کا نفقہ واجب ہے۔ (رُوح المعانی و احکام القرآن)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر اس کے پیٹ کے بچہ کے حصّے میں سے خرچ کیا جائے گا، اگر میت نے کوئی میراث چھوڑی ہو۔ اگر نہ چھوڑی ہو تو میت کے ورثاء کو اس پر خرچ کرنا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے : وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ج (البقرہ۔ ۲۳۳۔" (ابن جریر) حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت حسن بصریؒ حضرت سعید بن المسیب اور حضرت عطاء بن ابی رباح کہتے کہ "متوفی شوہر کے مال میں اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے۔" حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی ایک تیسرا قول یہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹) رو سے یہ کہیں کہ یہ محض خون کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ اسمیں آدمی کی صورت پائی جاتی تھی یا یہ رسُولی نہ تھی بلکہ آدمی کی اصل تھی تو ان کا قول قبول کیا جائے گا اور عدت ختم ہوجائیگی (مغنی المحتاج) حنابلہ اور حنفیہ کا مسلک بھی اس کے قریب ہے مگر اسقاط کے معاملہ میں انکا مذہب یہ ہے کہ جب تک انسانی بناوٹ ظاہر نہ پائی جائے محض دائیوں کے اس بیان پر کہ یہ آدمی ہی کی اصل ہے اعتماد نہیں کیا جائیگا اور اس سے عدت ختم نہ ہوگی ۔ (بدائع الصنائع، الانصاف)

منقول ہوا ہے۔ (احکام القرآن) ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ "اس کا نفقہ متوفی شوہر کے مال میں اسی طرح واجب ہے جس طرح اس کے مال میں کسی کا قرض واجب ہوتا ہے۔" (احکام القرآن) امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ امام زفرؒ کہتے ہیں کہ "میت کے مال میں اس کے لئے نہ سکونت کا حق ہے نہ نفقہ کا کیونکہ موت کے بعد میت کی کوئی ملکیت ہی نہیں ہے اس کے بعد تو وہ وارثوں کا مال ہے۔ اُن کے مال میں حاملہ بیوہ کا نفقہ کیسے واجب ہو سکتا ہے۔" (ہدایہ، احکام القرآن) یہی مسلک امام احمدؒ بن حنبل کا بھی ہے۔ (الانصاف) امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ "اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے البتہ اسے سکونت کا حق ہے۔" (مغنی المحتاج) اس کا استدلال حضرت ابوسعید خدریؓ کی بہن، فریعہ بنت مالک کے اس واقعہ سے ہے کہ ان کے شوہر جب قتل کر دیئے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ شوہر کے گھر ہی میں عدت گزاریں (ابوداؤد، نسائی و ترمذی) مزید برآں ایک اور روایت میں حضورؐ نے فرمایا لیس للحامل المتوفی عنہا زوجہا نفقہ "بیوہ حاملہ کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے۔" (دار قطنی) یہی مسلک امام مالکؒ کا بھی ہے۔ (حاشیہ الدسوقی)۔ صلۂ رحمی اور تقویٰ کا تقاضہ یہی ہے کہ بیوہ خواہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ اُسے سکونت و نان و نفقہ کچھ عرصہ دیا جائے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ	"ترجمہ:۔ تم میں سے جو لوگ وفات
وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا صلے	پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے
وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا	ہوں ان کو چاہیئے کہ اپنی بیویوں
اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ج	کے حق میں یہ وصیت کر جائیں
(البقرہ - ۲۴۰)	کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ

دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔"

عن عبداللہ بن عمرؓ۔ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

السمع والطاعة

علی المرء المسلم فیما احب وکرہ مالم یؤمر بمعصیۃ

تنظیم

از قلم: مولانا وحید الدین خاں
(ماخوذ از ماہنامہ الرسالہ، دہلی، انڈیا)

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کئے اور اللہ نے ان سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں کو مانو اور ان کی مدد کرو اور اللہ کو قرض حسن دو، اگر تم ایسا کرو تو یقیناً میں تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس اس کے بعد تم میں سے جس نے انکار کیا تو اس نے سواء السبیل کھو دی (مائدہ ۱۲)

ایک دانہ کے اندر خدا نے ایک سرسبز و شاداب پودا چھپا رکھا ہے اور ایک گٹھلی کے اندر ایک پورا درخت موجود ہے۔ مگر یہ امکانات صرف اس وقت بروئے کار آتے ہیں جب کہ دانہ یا گٹھلی کو مٹی میں ڈالا جائے۔ اگر ان کو شیشہ کی میز پر سجا کر رکھ دیا جائے تو نہ دانہ سے پودا نکلے گا اور نہ گٹھلی کبھی درخت کی صورت اختیار کرے گی۔ اسی طرح اللہ نے دنیا کی ہر چیز کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے اٹل ہے۔ ہر چیز اسی مقررہ قاعدہ پر قائم ہوتی ہے اور اسی کے مطابق بڑھتی ہے۔ اگر اس قاعدہ کی خلاف ورزی کی جائے تو کبھی مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ جو قوم آسمانی کتاب کی حامل ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا مخصوص ضابطہ ہے۔ ایسی قوم کس طرح زمین میں جڑ پکڑتی ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح حاصل کرتی ہے، اس کا ضابطہ مذکورہ آیت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس قرآنی ضابطہ کو یہاں سواء السبیل کہا گیا ہے۔

سواء السبیل (اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ) یہ ہے کہ آدمی دنیا میں ایک قسم کی پابند زندگی گزارے۔ وہ اس طرح رہے گویا کہ وہ خدا کے عہد کی رسی میں بندھا ہوا ہے۔ اس عہد کی زندگی کی پہلی شرط، ایمان کے بعد، یہ ہے کہ آدمی نماز قائم کرے یعنی اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دے، وہ اللہ کی قربت تلاش کرنے والا بن جائے۔ پھر وہ زکوٰۃ ادا کرے۔ یعنی وہ دوسرے بندوں کا اس حد تک خیر خواہ ہو کہ اپنی کمائی میں ان کا لازمی حق سمجھنے لگے۔ پھر یہ کہ اللہ کے دین کی دعوت کے معاملہ میں وہ غیر جانب دار نہ رہے، بلکہ اس میں اپنے آپ کو پوری طرح شامل کرے، وہ داعیان دین کی مدد کرے۔ اپنے بہترین اثاثہ کو اس کام کو مؤثر اور طاقت ور بنانے میں لگا دے۔ یہی وہ عہد کی زندگی ہے جو ہر فرد مسلم سے مطلوب ہے، اس زندگی کو اختیار کئے بغیر کوئی شخص خدا کی قربت و معیت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس قابل قرار پا سکتا کہ خدا اس کی مدد کرے۔

اس خدا پرستانہ زندگی کو اس کی صحیح صورت میں باقی رکھنے کے لئے تنظیم کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلم معاشرہ کے اوپر خدا کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے درمیان سمع و طاعت کا نظام قائم کرے۔ یعنی وہ اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو اپنا سربراہ مقرر کرے اور جب ان کا تقرر ہو جائے تو پسند ناپسند کو نظر انداز کر کے ان کی اطاعت کرے۔ نماز کی باقاعدہ اقامت، زکوٰۃ کی اجتماعی وصولی اور تقسیم، دعوت دین کا عمومی نظام، سب اسی وقت بہتر طور پر ادا ہو سکتے ہیں جب کہ مسلمانوں کے درمیان اجتماعی نظم قائم ہو، ان میں کچھ ایسے لوگ مقرر ہوں جو اس کی نگرانی کریں اور تمام لوگ اس کو ایک دینی فریضہ سمجھ کر اپنے سربراہوں کی اطاعت کریں۔

اس تنظیم سے مراد حکومتی تنظیم نہیں ہے۔ بلکہ وہ تنظیم ہے جو ہر حال میں مسلمانوں کے اپنے بس میں ہے، خواہ ان کے پاس سیاسی اقتدار ہو یا نہ ہو۔ اسلامی تنظیم حقیقۃً ایک عبادت ہے اور عبادت وہی مطلوب اور نتیجہ خیز ہے جو اختیاری طور پر ہو نہ کہ کسی خارجی دباؤ کے تحت۔ اسلامی تنظیم دراصل اس بات کی ایک دنیوی علامت ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خدا کے حکم کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلامی تنظیم میں اپنے کو باندھنا گویا خدائی اطاعت کے امتحان میں پورا اترنا ہے اور اسلامی تنظیم میں بندھنے کے لئے تیار نہ ہونا گویا اس خدائی امتحان میں ناکام ہو جانا ہے۔

مزید یہ کہ سیاسی اقتدار بذات خود تنظیم کے وجود کا ضامن نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے زمانہ میں حکومتی اقتدار موجود تھا، اس کے باوجود مسلمانوں کی تنظیم منتشر ہو گئی۔ اسی طرح بعد کے دور میں بھی اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تنظیم سے مراد ویسی ہی ایک اختیاری تنظیم ہے جیسی کہ مسجد میں امام کی سربراہی میں نماز کی جماعت بندی کے لئے ہر روز ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی خاطر اپنی آزادی پر پابندی لگانا ہے۔ یہ تمام تر ایک اختیاری تنظیم ہے اور اس کا ثواب کسی آدمی کو صرف اس وقت ملے گا جب کہ اس نے اپنے آزاد ارادہ سے اس کی ماتحتی قبول کی ہو۔ جبر کے تحت قائم شدہ تنظیم بعض دنیوی فائدے دے سکتی ہے مگر وہ آدمی کو خدا کے یہاں ثواب کا مستحق نہیں بناتی، نہ اس سے وہ برکتیں ظاہر ہو سکتیں جو حقیقی اسلامی تنظیم کے لئے خدا نے مقدر کی ہیں۔

دور نبوت میں اس قسم کی تنظیم کی ایک مثال وہ ہے جو ابتدائی دور میں مدینہ میں اختیار کی گئی۔ ہجرت سے پہلے مدینہ کے ۷۳ آدمی مکہ پہنچے اور آپ سے بیعت ہوئے۔ اس وقت مدینہ میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ مگر آپ نے بیعت کے بعد ان سے کہا کہ تم لوگ بارہ آدمی منتخب کر دو جن کو میں تمہارے اوپر نقیب (نگراں) بنا دوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اندر سے بارہ آدمی چنے۔ آپ نے ان کو مدینہ کے مسلمانوں پر نگراں مقرر فرمایا اور کہا کہ تم اپنی قوم کی اجتماعی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہو (انتم کفلاء علی قومکم) مسلمان عرب سے نکل کر جب مختلف ملکوں میں گئے تو اسی طرح وہ اپنی تنظیم بنا کر اس کی ماتحتی میں منظم زندگی گزارتے رہے۔ جب تک انھوں نے ایسا کیا ان کے اوپر خدا کا سایہ باقی رہا۔ جب انھوں نے تنظیمی پابندی قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدا کا سایہ بھی ان کے اوپر سے اٹھ گیا اور وہ دوسری قوموں کے حوالے کر دیے گئے۔

جو لوگ اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو ایک اسلامی تنظیم کا پابند کریں وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ بے نفس لوگ ہیں، انھوں نے اللہ کی خاطر اپنی انانیت کو ختم کر دیا ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو بے نفس بنا لینا موجودہ دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اللہ کی نظر میں جو لوگ اس معیار پر پورے اتریں ان کے لئے وہ اپنی ہر قسم کی نعمتیں انڈیل دیتا ہے، وہ دنیا میں بھی عزت اور غلبہ حاصل کرتے ہیں اور آخرت کی سرفرازی بھی ان کے لئے مقدر کر دی جاتی ہے۔ جو لوگ بے نفسی کی حد تک خدا کے فرماں بردار بن جائیں ان کے سامنے جب کوئی صحیح بات آتی ہے تو وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں۔ ان کا باہمی اتحاد کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ انصاف کے راستہ کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان کی بے نفسی ان کو ہر اس چیز کی طرف بڑھنے سے روک دیتی ہے جو دنیا و آخرت میں برباد کرنے والی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کا راز بے نفسی ہے۔ اور کوئی آدمی بے نفس بنا ہے یا نہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت تنظیم کے ذریعہ ملتا ہے۔ تنظیمی زندگی میں اپنے کو باندھنا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آدمی نفسانی محرکات سے اوپر اٹھ گیا ہو۔ وہ تنقید اور تعریف سے بلند ہو۔ وہ اختلاف اور اتفاق کی بنیاد پر کسی کے بارے میں رائے قائم نہ کرتا ہو۔ اس کا رویہ پسند ناپسند کی بنیاد پر نہ بنتا ہو۔ وہ اس سے بے نیاز ہو چکا ہو کہ اس کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ تنظیمی زندگی میں اس طرح کے مواقع بار بار آتے ہیں۔ اگر آدمی ان چیزوں سے اوپر اٹھا ہوا نہ ہو تو وہ اسی قسم کی باتوں میں الجھ کر رہ جائے گا اور تنظیم کی پابندی کو قبول کرنے میں ناکام رہے گا۔

اللہ کے مومن بندوں پر اللہ کی دو سب سے بڑی نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کی نصرت کے مستحق بن جاتے ہیں، وہ دنیا میں اپنے مخالفین کے مقابلہ میں خدا کی مدد سے غالب آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد وہ جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دئے جاتے ہیں۔ اللہ کی یہ دونوں نعمتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ کی خاطر اپنی انفرادیت کو ختم کر کے اجتماعیت کے بندھن میں بندھ جائیں اور اس کے تحت اپنی دینی اور اخلاقی زندگی کو منظم کریں۔

جو لوگ اپنے آپ کو اللہ میں اس طرح شامل کر لیں کہ اپنی انفرادیت کو وہ اس کے حوالے کر دیں، ان کی طاقت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کے درمیان وہ تمام اسباب بالکل ختم ہو جاتے ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرنے والے ہیں۔ اجتماعیت کو توڑنے والی چیز انفرادیت پر اصرار ہے اور اپنی انفرادیت کو اللہ کے حوالے کر کے پہلے ہی وہ اس سے اوپر اٹھ چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کا پورا گروہ ایک متحدہ طاقت میں ڈھل جاتا ہے۔ اور جہاں اتحاد ہو وہاں مغلوبیت کا گزر نہیں۔

جو لوگ انفرادی قربانی کی سطح پر دین کو اختیار کریں، ان کی زندگی خدا رخی زندگی بن جاتی ہے۔ وہ اس شاہ راہ پر چل پڑتے ہیں جو خدا کی قربت اور اس کی جنت کی طرف جانے والی ہے۔ ان کا سفر کبھی کھوٹا نہیں ہوتا، وہ کبھی راستہ کے دائیں بائیں نہیں مڑتے۔ وہ دین کے سیدھے راستے پر چلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ خدا کی جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔

مدیر "ترجمان القرآن" کی خدمت میں

از قلم

مولانا سیّد وصی مظہر ندوی
مہتمم مدرسہ جامعہ اسلامیہ و میئر بلدیہ حیدر آباد

ذیل میں مولانا سید وصی مظہر ندوی کی ایک تحریر ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع کی جارہی ہے - اس تمہیدی نوٹ میں موصوف نے جس قدر لجاجت سے "میثاق" میں اس تحریر کی اشاعت کی استدعا کی ہے اس کے پیش نظر یہ وضاحت ضروری محسوس ہوئی کہ ماہنامہ 'میثاق' اور ان سطور کے راقم پر مولانا ندوی کا "حق" نہایت قدیم بھی ہے اور حد درجہ 'ثابت' بھی -

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فروری ۱۹۵۷ء میں (فی الوقت کالعدم) جماعت اسلامی کا جو کل پاکستان اجتماع ارکان ماچھی گوٹھ (نزد صادق آباد ضلع رحیم یار خاں) میں پالیسی سے متعلق اختلافات پر تفصیلی بحث اور حتمی فیصلہ کے لئے منعقد ہوا تھا اس میں کوئی باقاعدہ 'حزب اختلاف' تو اگرچہ موجود نہ تھی، تاہم جس پالیسی پر تقسیم ہند کے بعد سے لے کر اس وقت تک عمل ہوتا آیا تھا اُس سے فی الجملہ اختلاف رکھنے والے بہت سے اکابر و اصاغر موجود تھے - ان میں سے اکابر کی اکثریت کا معاملہ تو بدقسمتی سے کچھ گول مول سا رہا اور وہ بعض مصالح کے پیش نظر یا مجبوریوں کے باعث کھل کر اپنا موقف پیش نہ کر سکے - لہٰذا میدان میں صرف چند 'اصاغر' رہ گئے - مثلاً ان سطور کا عاجز و ناکارہ راقم ـــــ یا برادرم ارشاد احمد

حقانی وغیرہ اور ان میں سے بھی سب سے زیادہ 'رسوائی' راقم ہی کے حصے میں آئی! چنانچہ جب راقم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی پیش کردہ قرارداد کے مقابلے میں ایک متبادل قرارداد پیش کر کے اس پر تقریر کرنے یا صحیح تر الفاظ میں اختلافی بیان پڑھنے میں مصروف تھا تو اس وقت جہاں اس نوع کی متضاد 'بیداد' سے سابقہ پیش آیا کہ کسی نے تو کھڑے ہو کر کہا کہ "ہمارے پاس اس بکواس کو سننے کیلئے وقت نہیں ہے!" (اور شاید یہ بات قارئین کی دلچسپی ہی نہیں "تفنّنِ طبع" کا ذریعہ بنے کہ اس قول کے قائل وہ صاحب ہیں جن کا شمار بعد میں 'تحریک جمہوریت' کے قائدین میں ہوا، یعنی پروفیسر عبدالغفور صاحب آف کراچی، اور کسی نے راقم کو 'قائدِ حزبِ اختلاف' قرار دے ڈالا اور ایوان سے مطالبہ کیا کہ اس حیثیت میں راقم کو اظہارِ رائے کا بھرپور موقع دیا جائے (یاد ش بخیر، یہ تھے جناب راؤ خورشید علی خان صاحب) وہاں یہ مسئلہ بھی شدت کے ساتھ سامنے آیا کہ اتنے طویل بیان کے لئے جتنا وقت درکار ہے اس کے لئے اجتماع کی مدت میں پورے ایک دن کی توسیع ضروری ہو جائے گی۔ اس پر ایک جانب تو کھڑے ہوئے محترم سردار محمد اجمل خان صاحب لغاری جنہوں نے یہ فرما کر راقم کے لئے شرمندگی کا سامان پیدا کیا کہ "ڈاکٹر اسرار جیسے کارکن تحریکوں کو روز روز نہیں ملا کرتے اگر ان کے خطاب کی وجہ سے اجتماع کی مدت میں ایک دن کی توسیع ناگزیر ہو تو اس کے جملہ اخراجات میں اپنے ذمے لیتا ہوں!" اور دوسری جانب کھڑے ہوئے مولانا سید وصی مظہر صاحب ندوی جنہوں نے فرمایا کہ: "میں نے بھی تقریر کا نوٹس دیا ہوا ہے، لیکن میں اسے واپس لے کر اپنا وقت بھی ڈاکٹر اسرار کو دیتا ہوں!" ——— راقم الحروف پر مولانا کے اس احسان کی بنا پر مولانا کا حق 'میثاق' کے صفحات پر ثابت ہی نہیں قائم و دائم ہے جسے وہ پورے اطمینان کے ساتھ استعمال فرما سکتے ہیں۔ ——— اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیر ترجمان القرآن کی خدمت میں

ترجمان القرآن ماہ جون و جولائی ۱۹۸۰ء کے اشارات سے متاثر ہو کر میں نے چند سطور محترم دوست نعیم صدیقی کو ارسال کی تھیں۔ ان سطور کا مقصد ان کی اشاعت نہ تھی۔ بلکہ اس قلبی تعلق کا اظہار تھا جو نعیم صدیقی صاحب کے ساتھ قائم ہے۔ اور اس تحریک کے ساتھ روحانی رشتے کا نتیجہ تھا۔ جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے بہترین ۳۰ سال صرف کئے ہیں کیونکہ اقامت دین کے اجارہ داروں نے اس تعلق کو اگرچہ بے رحمی کے ساتھ یکطرفہ طور پر منقطع کر دیا ہے۔ لیکن میں اس کی کسک کو آج بھی دل میں محسوس کرتا رہتا ہوں۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم بحث و فکر کے معاملے میں جس بات کی شدید مخالفت کیا کرتے تھے۔ ترجمان القرآن کے صفحات کو اسی بات کا ارتکاب کر کے داغ دار بنا دیا ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے مصنوعی کمزور پوزیشن میری جانب منسوب کی گئی اور پھر نہایت "بہادرانہ" تابڑ توڑ حملے کر کے قارئین کو تاثر دیا گیا کہ "دشمن" کو تہس نہس کر دیا گیا ہے۔ یہ لکھتے ہوئے بے حد صدمہ ہوتا ہے کہ جناب نعیم صاحب کا یہ جواب میری تحریر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کی ایک ایک سطر افترا پردازی اور وسوسہ اندازی کا شاہکار ہے۔ یہاں پر بھی جناب نعیم صدیقی صاحب نے وہی موقف اختیار کیا جس کی مذمت مولانا مودودی مرحوم ہمیشہ کیا کرتے تھے کہ کسی کی مخالفت میں خوب خوب غلط بیانی کر کے لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر دو ظاہر ہے کہ اس کا جواب ان سب لوگوں تک نہ پہنچ سکے گا جن کے ذہنوں کو مسموم کیا جا چکا ہے۔ اس لئے جو لوگ جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اس شخص کے مخالف بن جائیں گے وہ خالص نفع کی شکل میں تمہارے کیمپ میں آ جائیں گے۔

میرے محترم دوست اور منجھے ہوئے صحافی نے میری تصویر کشی اتنی چابکدستی

دستی اور مہارت سے کی ہے کہ میں باہر سے مخالفت کرنے والوں اندر رہ کر اختلاف کرنے والوں اور تحریک سے علیحدہ ہو جانے والوں کے تمام مذموم خصائص کا مجموعہ نظر آنے لگا ہوں۔ بہرحال مجھے ملا حیاں سنانا چونکہ انکی داخلی ضرورت ہے۔ جسکے ذریعہ اپنے مؤکلوں کو مخلصانہ وکالت کا یقین دلا سکتے ہیں اس لئے گالیاں سنکر "بے مزہ" نہ ہونگا۔

ان کا موکل نعیم صاحب کے اس اظہار کے علی الرغم کہ وہ میرے جواب دینے کے لئے موجود نہیں ہے: اپنے نام نہاد دستور اور ملک کے رائج الوقت نظام کے خلاف زیر زمین پورے تنظیمی ڈھانچے کے ساتھ موجود ہے۔ انتخاب بھی ہو رہے ہیں اور اجتماعات بھی حتیٰ کہ اختلاف رکھنے والوں سے محض ربط وضبط کی بنا پر رکنیت کی معطلی اور معافی کے بعد بحالی کے فیصلے بھی کئے جا رہے ہیں اس وجہ سے مجبوراً میں اپنی تحریر کی اشاعت کیلئے ماہنامہ میثاق سے درخواست کر رہا ہوں کہ وہ اگر ممکن ہو سکے تو ان کی اشاعت کے لئے اپنے چند قیمتی صفحات کا زیاں برداشت کرے ممکن ہے کہ "گھر والوں" میں سے کسی کی نظر میری اس تحریر پر پڑ جائے اور ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ ایک ایسے مظلوم کی فریاد ہے جو گھر سے نکالا نہیں نکالا گیا ہے۔

فقط والسلام سید وصی مظہر ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اپریل تا جون ۸۰ء کے اشارات میں آپ نے تحریک اسلامی اور دعوت اسلامی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی وجہ سے میرے اس یقین میں اور بھی اضافہ ہوا کہ آپ کو گذشتہ چند برسوں میں اگرچہ تحریک اسلامی کے عملی حالات سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن حالات کی ہر کروٹ پر آپ نگاہ رکھتے ہیں۔ اور تحریک جن اجتماعی و انفرادی مسائل سے دوچار ہے ان سے آپ بخوبی واقف ہیں۔

آپ کے اشارات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مسائل کے بارے میں تحریک کے اندازِ فکر و عمل (APPROACH) میں کیا خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ آپ نے سوال ہی کے انداز میں سہی تحریک اور اُس سے وابستہ افراد کی ان تمام غلطیوں اور کمزوریوں کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ جن میں وہ مُبتلا ہو چکے ہیں۔ مثلاً محرمات کے ساتھ مصالحت، اصلاحِ ذات کے معاملے میں غفلت، دعوتی رابطوں کی وسعت اور گہرائی میں خطرناک حد تک کمی، تعلق باللہ کے باب میں سہل انگاری۔ پارلیمانی سیاست میں مبتلا ہو کر خالص سیاسی پارٹی کے سے انداز و اطوار کو اپنانا محض وقتی حالات کے مدّوجزر پر نگاہ رکھنا اور کارِ دعوت سے بے نیازی پارلیمانی سیاست یا کسی موجود الوقت سیاسی نظام کے خلاف عملی تحریک کے ضمنی مشاغل کو اصل کام سمجھ لینا، جوشیلی تقریریں اور غیر حقیقی قوّت کی نمائش لیکن حقیقی قوّت کے حصول کی کوشش میں تغافل و تساہل سیاسی منافرت انگیزی میں شدت، دعوتی خیر خواہی اور ہمدردی کا فقدان، بندگانِ خدا کو بندگیٔ رب کی طرف لانے کی کوشش کو ترک کر کے محض رائے دہندگان کی تعداد میں اضافے کے درپے ہونا۔

غرض یہ کہ آپ نے دین و سیاست کو جمع کرنے یا انتخابی اور دعوتی سرگرمیوں کو بیک وقت لے کر چلنے کے تجربے میں اس حد تک ناکامی کا اعتراف کر لیا کہ سیاسی اور خانقاہی دائروں کی تقسیم کی تجویز کو بھی ناگزیر برائی کی حیثیت سے قبول کر لینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

جون شمارے کے شمارے میں یہ سارے اعتراف موجود ہیں جن کو دیکھ کر ایک طرف آپ کے مطالعۂ حالات کی صداقت، دوسری طرف غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف کی جرأت کو داد دینی پڑتی ہے۔ لیکن جولائی کے شمارے میں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ آپ نے اس صورتِ حال کی گہرائی میں اُتر کر اسکے اصل اسباب معلوم کرنے کی یا تو سرے سے کوشش ہی نہیں کی یا اصل اسباب کو عمداً نظر انداز کر کے سطحی طور پر انہی تدابیر کا اعادہ کر دیا کہ جن کے بارے میں تحریک اور اُس سے وابستہ حضرات کا عملی جواب یہ رہا ہے۔ کہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

خدارا مجھے بتایئے کہ آپ نے جولائی کے شمارے میں اصلاحِ احوال کے لئے جن تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ کیا اُن میں کوئی ندرت ہے؟ کیا وقتاً فوقتاً تحریک کے پُرانے

خادم انہی خطوط پر اصلاحِ احوال کی کوششیں نہیں کرتے رہے ہیں۔؟ لیکن تحریک نے اُن لوگوں کو سَروں پر بٹھایا جو پُرجوش مخالفانہ تقریر کے ماہر ہوں۔ مگر اس کے برعکس جن لوگوں نے سچی خدا پرستی اور پیروئ رسول کی دعوت دی۔ وہ نامقبول ٹھہرائے جاتے رہے۔ سوچئے تو سہی کہ کیوں تقریروں اور گفتگوؤں کا رُخ دعوت کی طرف مڑنے کے بجائے ہمیشہ حریفوں پر چوٹیں کرنے پر مرکوز رہا۔ کیوں پتّہ ماری کے وہ کام جو آپ نے گنائے ہیں۔ اور جن کی اہمیت کی طرف خود تحریک اور اس کے اہلِ فکر لوگ اکثر توجہ دلاتے رہے ہیں۔ ہمیشہ نظر انداز کر کے جلسوں، جلوسوں اور پوسٹروں پر پوری قوّت صرف کی جاتی رہی۔

اگر آپ میری صاف گوئی کو معاف کریں تو میں کہوں گا کہ آپ کے یہ اشارات صرف ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ تحریک کی صفوں میں اگر کچھ سوچنے والے دماغ اور فکرمند دل اب باقی رہ گئے ہوں تو وہ تجزیہ کو دیکھ کر اور تدابیر کو سُن کر ایک دفعہ پھر مطمئن ہو جائیں۔ اور شجر سے پیوستہ رہ کر امیدِ بہار کے سہارے جیتے یا سکتے رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ذوق کی یہ خرابی۔ مذاق کی یہ تبدیلی جس کی بنا پر جو کچھ "ناخوب" تھا وہ بتدریج خوب قرار دے دیا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ کو جب تک دور نہ کیا جائے گا۔ محض وعظ کے ذریعے اس انقلابِ معکوس کو نہیں روکا جا سکتا۔

اس رجعتِ قہقری یا انقلابِ معکوس کا بنیادی سبب دراصل یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کا وہ نصب العین جس کے لئے یہ قافلہ جمع ہوا تھا۔ غیر شعوری طور پر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اس نصب العین کی جگہ تدریج ایک دوسرے ہی نصب العین نے لے لی۔ اب آپ اصل نصب العین کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر جن کوتاہیوں کی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے وجود سے واقعاتی طور پر نہ کوئی انکار کر سکتا ہے اور نہ منطقی طور پر کوئی شخص ان کوتاہیوں کو جائز اور درست ٹھہرا سکتا ہے۔ کیونکہ زبانی اقرار اور تحریر و بیان کی حد تک تو نصب العین وہی ہے جو آپ بیان کرتے ہیں اور قافلہ کو جمع کرنے کے لئے جس کا اعلان کیا گیا تھا۔

لیکن ذہن و فکر میں چونکہ نصب العین وہ نہیں رہا جو آپ بیان کر رہے ہیں بلکہ منزلِ مقصود کچھ اور ہی شئی بن چکی ہے جس کے حصول کے تقاضے کچھ دوسرے ہی ہیں۔ اس لئے زبانی طور پر خواہ آپ کی تنقید کی سچائی کو تسلیم کیا جائے لیکن عملی طور پر اُسی رستے پر قدم بڑھتے ہیں۔ اور اُن ہی طور طریقوں کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے جو اس بدلے ہوئے

نصب العین سے مطابقت رکھتے ہیں۔

میں اپنی بات کو روزمرہ کی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں " فرض کیجئے کہ ایک بچے نے غیر شعوری طور پر کسی فلمی اداکار کو اپنا ہیرو بنالیا ہے۔ دوسری طرف اُس کے والد ماجد اُس کو ایک اچھا ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے ہوں۔ ایسی حالت میں والد صاحب کی نصیحتوں کو خواہ زبانی طور پر بچہ درست تسلیم کرلے مگر عملاً اپنے خیالی ہیرو کے رنگ میں رنگے جانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اور ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے لئے جو ضروری تقاضے ہیں اُن کو اپنی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ سمجھے گا۔

باپ کے خیال سے اگر اُن میں سے کوئی تقاضہ اُسے پورا بھی کرنا پڑ جائے تو انتہائی ناگواری کیساتھ اُسے پورا کرے گا۔ بالکل اسی طرح سے ہوا یہ کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اقامتِ دین کا جو عظیم الشان نصب العین تحریک اسلامی کی تاسیس کی بنیاد تھا۔ وہ بتدریج نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور اُس کے بجائے ایک دوسرا نصب العین عملی طور پر اختیار کرلیا گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کی صورت میں جو مصنوعی انقلاب برپا ہوا اُسکے دباؤ کے تحت تحریک نے فیصلہ کیا کہ اُسکے پاس جو بھی قوت ہے اُس کے ذریعے سے زور لگاکر سیاسی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور پھر حقیقی اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے حکومت کے ذرائع اور وسائل کو بھی استعمال کرکے ملّتِ پاکستان کو جلد از جلد دعوت اسلامی کی علمبردار ملّت میں تبدیل کردے۔ لیکن کچھ تو اپنی قوت کا اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی۔ کچھ ملک کی سیاسی قیادت کی پشت پر کام کرنے والی باطل کی عالمی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کا صحیح اندازہ لگایا جاسکا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے ایک طرف ملک سے بتدریج جمہوریت کا خاتمہ کردیا گیا۔ دوسری طرف تحریک کے خلاف تمام گروہوں اور طبقوں کو سرگرم عمل کردیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی قیادت پر قبضہ کرنے کی منزل دور سے دور ہوتی چلی گئی۔ اور اس منزل کے حصول میں ہم اس درجہ کھوئے گئے کہ ہم اپنے دشمنوں کی چالوں کو کماحقہٗ سمجھ بھی نہ سکے۔ ہم نے مسلمانوں کی اسلامیت کا ڈھنڈورہ اس طرح پیٹا اور اُن کے آزادانہ ووٹ سے اسلامی قیادت کے وجود میں آجانے کے یقینی

ہونے کی اتنی پرزور وکالت کی کہ خود اپنے استدلال سے متاثر ہو گئے۔ اور ہم نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ فی الواقع پاکستان کے مسلم معاشرے میں وہ تمام ابتدائی کام مکمل ہو چکا ہے جو اقامتِ دین کے لئے ضروری ہے۔ اور اب معاشرے میں دین کو قائم کرنے کی شدید طلب پیدا ہو چکی ہے۔ بس ایک دفعہ ان کو اظہارِ رائے کا آزادانہ موقع ملجائے تو صالح قیادت برسرِ کار آجائیگی۔ اور دین کی اقامت کا کام مکمل ہو جائے گا۔

لیکن جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دشمنوں نے بتدریج جمہوری عمل کو بند کرنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح ہماری لڑائی کا رُخ بھی بتدریج جمہوریت کی بحالی کی طرف مڑ گیا۔ اس طویل جنگ میں ہم کو یقین ہوتا چلا گیا کہ دشمن جمہوریت کی راہ اس لئے روک رہا ہے کہ اگر آزادانہ انتخاب ہوئے تو جمہور کا فیصلہ اسلامی نظام کے حق میں جائے گا۔ اس لئے ہم بیحد خلوص کے ساتھ بحالیٔ جمہوریت کی "مقدس جنگ" میں ہمہ تن مشغول ہو گئے کاش! جمہوریت کو یہاں ایک ہی دفعہ میں ختم کر دیا گیا ہوتا تو شاید ہم کو اپنے طریقہ کار پر نظرِ ثانی کی توفیق مل جاتی۔ لیکن جمہوریت کو آہستہ آہستہ ختم کیا گیا۔ اس لئے جمہوریت کی بحالی کے لئے ہماری جدّوجہد بھی بتدریج شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔

پھر ہم کو صوبائی یا مرکزی سطح پر چند بار انتخابات میں حصّہ لینے کا جو موقع ملا۔ اور اُس میں ہم کو جن ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس سے سبق حاصل کرنے کی بجائے ہم نے یہ فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ عوام کی تعلیم اور کارکنوں کی تربیت کیلئے انتخابات میں بار بار شرکت ضروری ہے۔ لیکن ہم بھول گئے کہ انتخابات میں عوام کی تعلیم اور انتخابی مہم میں حصّہ لینے والوں کی تربیت جس انداز کی ہوتی ہے وہ تحریکِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے بالکل منفی تعلیم و تربیت ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جو نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے باعث یا یوں کہئے کہ جس کو عمداً دیکھنے سے انکار کے باعث ہماری ساری تگ و دو ہم کو تحریکِ اسلامی کے تقاضوں سے دُور کرتی چلی گئی۔ انتخابات کے اندر ہماری ہر ناکامی ہم کو نہایت مؤثر عملی انداز میں تحریکِ اسلامی کے ان خصائص کو چھوڑنے پر مجبور کرتی چلی گئی جو کہ انتخابی طریقہ کار سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اور اُن طور طریقوں کو اپنانے کا عملی سبق ملتا چلا گیا جن کے ذریعے دوسرے لوگ انتخابات میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

مثلاً۔ ہم نے سوچا کہ اگر ہم عوام کو دین کے صحیح تقاضے بتائیں جو ان کی انفرادی زندگی میں تطہیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تو یہ بات عوام کو پسند نہیں آئیگی۔ اور اگر ہم نے اُس لٹریچر کو پھیلانے کی کوشش کی جو لٹریچر عوام کے جاہلانہ عقائد، ان کے مشرکانہ ایمان اور اُن کے رسم و رواج کے خلاف ہے تو وہ ہم کو ووٹ نہ دیں گے۔ لہٰذا اُن کو یہی بتایا جائے کہ عوام تو ٹھیک ہیں بس حکومت کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح عوام کی تعلیم ہم نے اسی نہج پر کرنا شروع کر دی جو جیتنے کی خواہاں ہر سیاسی پارٹی کرتی ہے۔ یعنی مخالفوں پر تیز و تند نکتہ چینی اور اپنی "خوبیوں" اور "خدماتِ عوام" کی بیجا تشہیر، جھوٹی قوت کا مظاہرہ، روزمرہ کے سیاسی مسائل سے تعرض، دعوت کے تقاضوں کو بیان کرنے سے احتراز یہ سارے کام اسی لئے تو ہوئے کہ انتخابی طریقہ کار کو مستقلاً اپنا لینے کے باعث اب عوام کی تعلیم و تربیت اسی انداز پر درکار تھی۔

پھر کارکنوں کو بھی انتخابی ہتھکنڈوں میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی چلی گئی۔ ابتداءً تحریک اسلامی کے کارکنوں کی حیثیت سے ان کو ہر غلط طریقہ اختیار کرنے میں جھجک محسوس ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ "نظریہ ضرورت" و "نیت کی صحت" اور تحریک کے اندر اور باہر کے مخالفوں کو خاموش کر دینے کی غرض سے ایک دفعہ کامیاب ہو کر دکھا دینے کے جذبے نے ہر غلط طریقہ کو جائز کر لینے پر آمادہ کر لیا۔

پنجاب کے پہلے صوبائی انتخابات میں اصول پرستی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص خود رضاکارانہ جعلی ووٹ ڈالنا چاہتا تو کارکن اُس کو سختی کیساتھ منع کرتے لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جعلی ووٹ رہنماؤں کے علم میں ڈالے گئے، مگر انہوں نے اس قسم کی حرکتیں کرنے والوں کو نہ صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ کسی درجہ میں اُن کی طرف سے حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ پھر ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں تو بات اس حد تک جا پہنچی کہ ذمہ دار ارکان نے سیاہی مٹانے والے لوشن ایجاد کر کے ان کو استعمال کیا اور تحریک کے علم میں ہونے کے باوجود اُن لوگوں کا کوئی احتساب نہ کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں نعرے، تقریریں، الزامات، حرکات و سکنات غرض ہر پہلو سے تحریک اسلامی کے کارکن ماشاءاللہ ایک دنیادار سیاسی پارٹی کی سطح پر آچکے تھے۔ بیگمات

کے خلاف غیر مہذب نعرے، بھنگڑا ناچ، بے پردہ خواتین کے جلوسوں کی قیادت، توڑ پھوڑ کی اسکیموں میں رہنمائی۔ جلسوں اور جلوسوں کی ہماہمی میں نمازوں سے بے نیازی۔ غرض یہ کہ یہ سب کچھ جائز بلکہ مستحسن ٹھہرالیا گیا۔

خدارا سوچئے! کہ بیماری کے یہ مظاہر کیا محض سطحی خرابی کا پتہ دیتے ہیں۔ کہ جس کے لئے مرہم پٹی کی تجاویز پیش کی جارہی ہیں۔ یا ان سے ذہن و فکر کے بیمار ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اگر ہم اب بھی خود فریبی سے نہ نکلے اور محض غفلت کے ٹیکوں اور قوت کے بجکشنوں سے کام چلانے کی کوشش کرتے رہے تو یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہم نے تحریک اسلامی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ فقط والسلام

سید وصی مظہر ندوی، مہتمم مدرسہ جامعہ اسلامیہ مٹھڈی سڑک، حیدرآباد سندھ

(بقیہ صفحہ ۸۰)

الفاظ قرآنی "اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی ہم نے ان پر فرض نہ کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اُسے ادا نہ کیا"۔۔۔۔۔۔ ۵۷ : ۲۷ اگر رہبانیت بذاتہ اچھی چیز ہوتی تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام میں داخل کر دی جاتی۔ معلوم ہوا کہ بدعت کا آغاز اللہ کی خوشنودی کی خاطر ہی ہوتا ہے مگر بدعت انسانی ذہن کی پیداوار ہونے کی وجہ سے ناقص ہوتی ہے اور ایجاد کرنے والے اُس میں پیدا ہونے والی قباحتوں کو روک نہیں سکتے۔ بدعت کا انجام کے اعتبار سے ناقص ہونا اسی بات سے ظاہر ہے کہ اُسے علام الغیوب نے خود دین میں شامل نہیں کیا۔ ہر وہ عبادت بدعت کہلائے گی جس کی ادائیگی کی نظیر رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں نہیں ملتی۔

کاش کہ مسلمان اُسوۂ رسولؐ اور خلفائے راشدین کے طریقے کو اپنائیں آسان اور سہل دین پر عمل کریں اور اسلامی عبادات میں اضافے کر کے منصبِ رسالت میں مداخلت کی جسارت نہ کریں۔

مراد آباد (بھارت) سے دو خط اور ایک پیغام

مُراد آباد (بھارت) کے محترم افتخار احمد فریدی صاحب کے بعض خطوط اس سے قبل بھی میثاق میں شائع ہوئے ہیں - ان کا زیادہ عملی لگاؤ تو اگرچہ جماعت تبلیغی سے ہے لیکن دین کے ساتھ ان کا ذہنی اور قلبی تعلق جماعتی اور گروہی نسبتوں سے وسیع تر بھی ہے اور عمیق تر بھی، وہ ایک حد درجہ درد مند دل کے ساتھ ساتھ ایک نہایت فعّال اور متحرک شخصیت کے بھی مالک ہیں - اور اس کے باوجود کہ وہ اوائل عمر ہی میں کسی حادثے میں ایک پوری ٹانگ سے محرُوم ہو گئے تھے - خدمتِ دین کے لئے ان کے جوش و خروش اور جذبہ و امنگ میں ہرگز کوئی کمی نہیں آئی بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس جسمانی معذوری کی تلافی بھی اپنے جذبۂ عمل سے اس حد تک کر دی ہے کہ ہم ایسے سب ہاتھ پاؤں سلامت رکھنے والے لاکھوں لوگ ان پر رشک کرنے پر مجبُور ہیں۔ ؎

این سعادت بزور بازو نیست   تانہ بخشند خدائے بخشندہ !!

ان کا ایک خط راقم الحروف کے نام، ۹ جولائی کا مرقومہ، دوسرا ۲۰ نومبر کا تحریر شدہ —— اور ایک مطبُوعہ ورق کی صورت میں پیغام پوری ملّتِ اسلامیہ کے نام ہدیۂ قارئین ہے

اسرار احمد

مراد آباد - ۹ جولائی

محترم مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زیدہ مجدکم

السلام علیکم   مزاج گرامی

جون کے میثاق میں الفتنۃ الکبریٰ کے عنوان سے آپ کی تقریر شائع ہوئی ہے یہ بہت

ہی اہم اور ضروری مضامین پر مشتمل ہے جزاکم اللہ خلفائے راشدین خصوصًا حضرت عثمان غنیؓ حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کے کاموں پر جو تبصرے فرماتے ہیں یہ بہت ہی ضروری اور ہم لوگوں کی ایمان کی سلامتی کے لئے انتہائی کارآمد ہیں حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ خلفائے راشدین کے ہر دور کے طریقہ کار کے مصالح کی جو توضیحات فرمایا کرتے تھے وہی انداز آپکی اس تقریر میں ہے۔

یہودیت کے ذریعہ عالم انسانیت کو کیا کیا ملتا رہا! اس پر بھی آپکے ارشادات بہت ہی ضروری اور وقت کارآمد ہیں آپ کے لئے دل سے دُعا نکلی مفکرین ملت، علمائے کرام، یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالر حضرات کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے عالم انسانیت کی تخریب میں یہودیت کس طرح کارفرما ہے اس پر ماضی وحال مستقبل سب پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پولوس، عبداللہ بن سبا، کارل مارکس، آئن سٹائن ایٹم کا بانی ترکی کے نومسلم یہودیوں کی تنظیم ودل سالمہ، فری میس، ہرزل، صہونیت سُلطان عبدالحمید ثانی خلیفہ ترکی کے خلاف سازش۔ یہودی خون ماں کے ذریعہ پانے والے کمال اتاترک جن کے ذریعہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے لیکر سلطان عبدالمجید خان تک چلنے والی خلافت زتیرہ سوچالیس سال مسلسل کا خاتمہ دونوں جنگ ہائے عظیم۔ اسرائیل کا قیام، بیت المقدس کا یہودی قبضہ پچھلے سال بیت اللہ کا حادثہ۔ ان میں بھی ماں کے ذریعہ یہودی خون کارفرما تھا لینن، اسٹالن، موجودہ روسی حکمران۔ یورپ وامریکہ کے یہودی ان سب سے عالم اسلام کو روشناس کرانے کی ضرورت ہے خدا کرے کہ یہ بات آپ کے دل میں اُتر جائے یہ عنوان مستقل میثاق کا کردیا جائے اور اس پر لکھنے والوں کو تحریک کی جاتی رہے۔ ہماری ملت کے وہ نونہال جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پل رہے ہیں اُن کو مسلسل تحریض ترغیب کی جاتی تاکہ وہ اپنی ریسرچ کا موضوع کسی یہودی کارگذاری کو اختیار کریں۔

حضرت علیؓ کو خدا کہنے والے نُصیری فرقے اور دروزی قبیلہ جو یہ عقیدہ رکھتا ہے پر بھی لکھنے کی ضرورت ہے اس وقت عالم عربی میں دروزی قبیلہ فوجوں میں کارفرما ہے۔

دوسری غرض یہ ہے کہ قرآن پاک کے ذریعہ جو کام ہوتے رہے ہیں اُس کی تاریخ میں مرتب ہونی چاہیے فی الحال میثاق کا ایک عنوان یہ بھی رہنا چاہیئے مثلاً

یہودیت ودھریت سے معمور دور کمالی میں سعید نورسیؒ نے قرآن پاک کے ذریعہ اس طوفان کا کس طرح مقابلہ کیا اس پر مفصل لکھا جانے ایسے بہت سے خدمت گزار عالم اسلام میں پائے جاتے ہیں جن پر لکھنے کی ضرورت ہے۔ خادم افتخار فریدی

مُراد آباد ۲۰ رنومبر ۸۰ء

محترم مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دام مجدھم ، السّلام علیکم

مزاج گرامی

تین ماہ ہونے کو آئے مراد آباد ابھی خاک وخون ہی میں لوٹ رہا ہے۔ بہرحال عید کے دن کا خون اس ملت کی آبیاری میں بڑا کام دے گا جس طرح اور جس مقدار میں اور جس جگہ بہایا گیا اس کی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں ہے پندرھویں صدی میں جن اقوام کو خدا ہدایت سے نوازے گا اُن ہی کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کو بہایا ہے' عید کے دن کا مختصر حال ارسال ہے جی چاہے تو 'میثاق' میں دیدیجئے گا۔ اگست، ستمبر، اکتوبر کے میثاق نہیں مل سکے نومبر کا ملا کر چاروں روانہ فرمائیں۔

اس وقت قرآنی دعوت کا میدان ہمارا ملک ہے۔ ملّت ہندیہ کے لئے خصوصاً مراد آباد کے مظلوموں کے لئے بہت ہی دُعاؤں کی درخواست ہے۔ جو دُعائیں شہداء کے خون کے واسطہ سے تحریر کی ہیں اُنہیں ذرا وضاحت کے ساتھ نمایاں جگہ پر میثاق میں دیدیجئے گا۔ والسّلام۔ خادم افتخار فریدی

فریدی صاحب کا پیغام مسلمانانِ عالم کے نام اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں

بقیہ صت ۱۱۹

جاپان، اسپین جرمنی انگلستان کو خدا ہدایت نصیب فرمائے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر (علامہ اقبالؒ)

عید ان کی ہے جو ہوں اسلام کے مقتل میں ذبح
ان کا سر ہے اور شہادت کا چمکتا تاج ہے ! (مولانا ظفر علی خاں)

مراد آباد کے معصوم بچّوں کی شہادت

"بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں" !!!

(مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۱۳ء)

"نہ گور ہے، نہ کفن ہے، نہ رونے والے ہیں" ! (ظہیر دہلوی ۱۸۵۷ء کے شہداء)

مراد آباد کی عیدگاہ کے میدان، عید الفطر کی نماز میں ظالم پولیس اور پی اے سی کے ہاتھوں گولیاں کھا کر گرنے والے سینکڑوں بچے، بوڑھے، جوان جن کو پھر خوفزدہ بھاگنے والے لاکھوں کے مجمع نے بھی کچلا۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں جو مظالم جلیانوالا باغ امرتسر اور کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے انہدام پر احتجاج کرنے والے مجمع کا گورا فوج نے جو کھلیان کیا تھا یہ المیہ اُس سے بہت بڑا ہوا ہے۔ آزادیٔ ہند کے بعد پولیس ایکشن والے فسادات میں جتنے مظالم اس ملک میں مسلمانوں پر توڑے گئے ہیں اُن میں یہ عیدگاہ کا گنج شہیداں اپنی اَلمناکی، درندگی اور بے کسی ایسی کہ شہیدوں کی لاشیں بھی اُن کے ورثاء کو نہیں دی گئیں (نہ گور ہے، نہ کفن ہے، نہ رونے والے ہیں) گیارہ دن مسلسل گھروں سے نہیں نکلنے نہیں دیا۔ ان گیارہ دنوں میں خوب لوٹا جلایا گھروں اور مساجد، دکانوں کو اور گولیوں سے اُڑایا جاتا اور جلتی آگ میں سسکتی لاشوں کو ڈالا جاتا رہا اور ہزاروں کو گرفتار کر کے خوب مار لگائی گئی جس کے سبب جو مر گئے انہیں جلا دیا گیا اور جو زندگی بھر کے لئے معذور ہو گئے اُن کی تعداد بھی کافی ہے ! بعض لاشوں کو کتے کھاتے رہے جہاں آگ مہیا نہ ہو سکی یا آگ پورا نہ جلا سکی۔ بھنگی اور آر ایس ایس کے ہندو غنڈے اس کارگزاری میں پولیس کے ساتھ پورے پورے شریک رہے۔

یہ واقعہ اس طرح سے چلایا گیا ہے کہ رمضان میں بھنگیوں کی بارات کے باجے

کا ایک مسجد کے سامنے مسلمانوں سے کچھ تنازعہ ہوا تھا۔ مراد آباد کے کلکٹر جو تبادلہ ہو کر دو ماہ پہلے آئے تھے ان کا اس تنازعہ کے بعد تبادلہ کر دیا گیا اور آریہ صاحب جو ہریجن اقوام سے تعلق رکھتے ہیں اور کئی ضلعوں میں رہ چکے ہیں اور اعظم گڑھ وغیرہ بعض اضلاع میں ان کے دور میں فسادات بھی ہوئے ہیں، بھیجے گئے۔

مراد آباد کی عیدگاہ میں جب مسلمانوں نے عید کی نماز شروع کر دی تو بھنگیوں نے جو نئے کپڑے پہن کر مسلمانوں کی شکل میں وہاں موجود تھے انہوں نے چند خنزیر جو ایک شرنارتھی پنجابی کے یہاں بند کر رکھے تھے اُنہیں نمازیوں کی صفوں میں داخل کر دیا اور نماز سے جب مسلمان فارغ ہوئے تو بھنگیوں نے پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا مسلمان بھی کچھ ان کے ساتھ لگ گئے۔ پولیس نے اس کے جواب میں گیس اور گولیوں کی بارش برسانا شروع کر دی اور جتنی گولیاں ان کے پاس تھیں سب کام میں لائے۔ بھنگیوں نے اس کام کو کر کے دوسرا مورچہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر گلشہید محلہ کی پولیس چوکی پر پہنچ کر آگ لگائی وہاں پہلے سے اسکیم کے مطابق کوئی پولیس والا موجود نہیں تھا عیدگاہ سے واپس ہونے والا مجمع بھی جو غم میں ڈوبا ہوا تھا مسلمان نما بھنگیوں کے ساتھ چوکی ڈھانے جلانے میں لگ گیا۔

مسلمانان عالم خصوصاً ملت ہندیہ سے گذارش ہے کہ ان مظلوم و معصوم شہیدوں کے خون کا واسطہ دیکر حق تعالےٰ سے حسب ذیل دعائیں مانگیں۔ حجاج کرام عالم سے بھی درخواست ہے کہ یہ اس صدی کا آخری حج ہے ان دعاؤں کے لئے ہی اس حج کو مقصود بنائیں۔

۱ :۔ اقوام ہند کو خدا ہدایت نصیب فرمائے اور ظالموں پر عبرت ناک عذاب و قہر نازل فرمائے اور ملت ہندیہ کے بچہ بچہ کو اسلام کا داعی اور مجاہد بنا دے

۲ : عالم اسلام کے حکمرانوں نے پندرہویں صدی میں تمام عالم کے انسانوں کو سلام کا پیغام (دعوت) پہنچانے کے لئے اقوام متحدہ کے ۳۵ ویں اجلاس کو تجویز کیا ہے خدا اس دعوت کو اثر انداز فرمائے پہنچانے والوں پر بھی اور جن کو پہنچایا جا رہا ہے ان پر بھی۔

۳ : اس دور کے فرعون، نمرود، چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر و اسٹالن کے جانشین روس و امریکہ کی دجالیت (ایٹمی عذاب) سے تمام عالم کو خدا نجات نصیب فرمائے۔ چین

(بقیہ صـ ۱۱۹ ر ملاحظہ فرمائیں)

مکان نمبر ۱۵۲۲، بلاک نمبر ۱۵
فیڈرل بی ایریا - کراچی

مکرمی اور محترمی جناب ڈاکٹر صاحب السلام علیکم

ماہنامہ میثاق بابت ماہ اکتوبر ۷۹ء تا جون ۸۰ء موصول ہوئے - آپ کی نوازش کا شکریہ - خداوند کریم اپنے حبیب پاک کے صدقے اور طفیل میں آپ کے دینی و دنیاوی مراتب بلند فرمائے - آپ نے جو قرآن فہمی کی شمع روشن کی ہے اللہ پاک اس کی روشنی سے تمام عالم اسلام کے مسلمانوں کے سینوں کو منور فرمائے۔ سلسلہ تقاریر سیرت پاک نہایت بصیرت افروز ہے - اس سلسلہ میں ہر جگہ نیا پن ہے - دعوت فکر اور عمل ہے - میرے نزدیک اُسوۂ حسنہ پر عمل جو جنون سے مشروط ہے دین ہے ہر دل میں رسُول پاک کی محبت کی چنگاری دبی ہوئی ہے۔ آپ نے ہوا دینی شروع کی ہے - یقیناً اسے شعلہ بننا ہے - بھڑکنا ہے - آپ نے گم کردہ منزل کی جانب رہنمائی فرمادی ہے - آپ انشاء اللہ بہت جلد یہاں اک خوشگوار تبدیلی ملاحظہ فرمائیں گے - مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا اک واقعہ تحریر فرمایا ہے کہ وہ اک مرتبہ جیل میں مقید تھے وہاں ان کے ہم نشین کچھ چڑیاں بھی تھیں جو اُن کے معمولات میں مخل ہوا کرتی تھیں حضرتِ والا نے مفاہمت کی داغ بیل ڈالی اور انہیں دانہ ڈالنا شروع کیا - چڑیوں نے اوائل ایام میں کچھ التفات نہ کیا اور پھر دانے کے پاس آکر بیٹھنا شروع کر دیا - اُن چڑیوں میں اک چڑا جو اپنی ہیبت میں کچھ زیادہ بلند قد تھا - اُن چڑیوں کی رہنمائی کرتا - اِدھر اُدھر دیکھتا اور پھر سب کے ساتھ اڑ جاتا ہے کچھ دن بعد ایسا ہوا کہ اس چڑے نے پہل کی اور دانہ پر جو چونچ ماری اور پھر اس کی تقلید جتنے بھی جمے ہوئے قدم تھے وہ سب چل پڑے۔ حضرت والا - آپ نے پہلا قدم اٹھایا ہے - بڑھایا ہے - اب رُکے ہوئے قدم اٹھنے شروع ہوئے ہیں - اور جب قدم اُٹھ چکے ہیں تو منزل پھر پیروں کے نیچے ہے - میں لکھنا کیا چاہتا تھا - اور کیا لکھتا چلا گیا - معاف فرمائیں -

والسلام، خلیل احمد

مولانا امین احسن اصلاحی

دو مایہ ناز تصانیف جو کچھ عرصہ سے دستیاب نہ تھیں دوبارہ طبع ہو گئی ہیں

(۱)

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا

مبادیٔ تدبرِ قرآن

✱ صفحات ۲۰۰ ✱ مجلد مع گرد پوش ✱ قیمت فی نسخہ -/۱۶

(۲)

حقیقتِ دین

مشتمل بر

حقیقت شرک ✱ حقیقت توحید

,, تقویٰ ✱ ,, نماز

✱ صفحات ۳۳۲ ✱ مجلد مع گردپوش ✱ قیمت فی نسخہ -/۲۴

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ، لاہور

Regd. L. No. 7360

Monthly MEESAQ Lahore

29 | Nov. - Dec. 1980 | No. 11-12

تصانیف امام حمیدالدین فراہی ؒ

(۱)

مجموعہ تفاسیر فراہی

★ سائز : ۲۲×۲۹/۸ ★ اعلیٰ آفسٹ پیپر ★ صفحات : ۳۶۰
★ سنہری ڈالی والی عمدہ جلد ★ ہدیہ ۴۰/- (محصول ڈاک علاوہ)

(۲)

اقسام القرآن

★ بڑا سائز ★ سفید کاغذ ★ صفحات ۶۴ ★ غیر مجلد
ہدیہ: ۳/۷۵

(۳)

ذبیح کون ہے ؟

★ بڑا سائز ★ سفید کاغذ ★ صفحات ۸۸ ★ غیر مجلد
★ ہدیہ: ۳/۵۰

(اقسام القرآن اور ذبیح کون ہے ؟ دونوں بیک وقت طلب کرنے پر محصول ڈاک معاف !)

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ، لاہور
ملنے کا پتہ : 36 - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - فون - (852611)